تذکرہ

پیران پاگارہ

تبسم چودھری

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

تذکرۂ پیرانِ پاگارہ

مصنّف

تبسم چودھری

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

اشاعت ـــــ باراول تعداد ـــــ تین ہزار

جولائی سنہ ۱۹۷۵ء

قیمت ۱۵ روپیہ

ملنے کا پتہ

* پاکستان کے جملہ کتب فروش
* کنگری پرنٹرس، بیل خانہ روڈ
ٹنڈو ولی محمد، حیدرآباد سندھ
پوسٹ بکس نمبر ۱۶۴

انڈس پرنٹرز حیدرآباد (سندھ)

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

اغلاط نامہ

نمبر شمار	صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۱	۵	۳	تیلغ	تبلیغ
۲	۶	۲	ناطن	باطن
۳	۱۱	۱۵	مسمل	مشتمل
۴	۱۱	آخری	قادر	قادریہ
۵	۱۴	۱۱	امزا	اُمرا
۶	۱۴	آخری	سگھ	سکھ
۷	۱۹	۱۸	سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء	سنہ ۱۲۴۵-۴۶ھ
۸	۵۹	۱	مر	مرید
۹	۶۴	الفاظ کی تشریح	پگڑی والا	صاحب دستار
۱۰	۶۹	۱۴	اضل	اصل
۱۱	۸۶	۱۴	مورصین	مؤرخین
۱۲	۱۱۷	آخری	کھینے	کھینچے
۱۳	۱۱۸	۱۷	سنہ ۱۲۳۶ھ	سنہ ۱۲۴۶ھ
۱۴	۱۱۹	۱۴	پیچے	پیچھے
۱۵	۱۳۴	آخری	یہلا	پہلا
۱۶	۱۵۴	۱۸	انگریزن	انگریزوں
۱۷	۱۶۶	۳	سنہ ۱۳۲۷ء	سنہ ۱۳۲۷ھ
۱۸	۲۰۰	۹	اَنفتَنَۃُ	اَلفِتنَۃُ
۱۹	۲۴۳	۵	NOTBS	NOTES

پبلشر:- سید سردار علی شاہ نے کنگری پرنٹرس بیل خانہ روڈ ٹنڈو ولی محمد حیدر آباد کی طرف سے شائع کیا۔

Phone : 23561

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

پاگارہ خاندان کے ساتویں اور موجودہ سجادہ نشین سید سکندر شاہ الملقب بہ شاہ مردان شاہ ثانی (چھٹ دھنی)

اِنتساب

ان غازیوں کے نام جو دین اور وطن
کے تحفّظ کی خاطر شمشیر و سناں اور دار و رسن
سے کھیلتے ہوئے شہادت سے ہم آغوش ہو گئے

درگاہ عالیہ راشدیہ "پیر گوٹھ" جس کی از سرِ نو تعمیر ہو رہی ہے۔ اسمیں حضرت پیر محمد راشد روضے دھنی رحمت اللہ علیہ
اور پہلے پانچ پاگارہ حضرات مدفون ہیں

درگاہ عالیہ راشدیہ سے ملحق مسجد شریف کا منظر

جامعہ راشدیہ "پیر گوٹھ" کی عمارت

(اوپر) درگاہ راشدیہ کی فصیل کا بیرونی دروازہ
(نیچے) حضرت پیر سائیں پاگارہ کی رہائش گاہ کا دروازہ اور ملحقہ زیارت گاہ

حضرت پیر سائیں پاگارہ کی رہائش گاہ واقع پیر گوٹھ

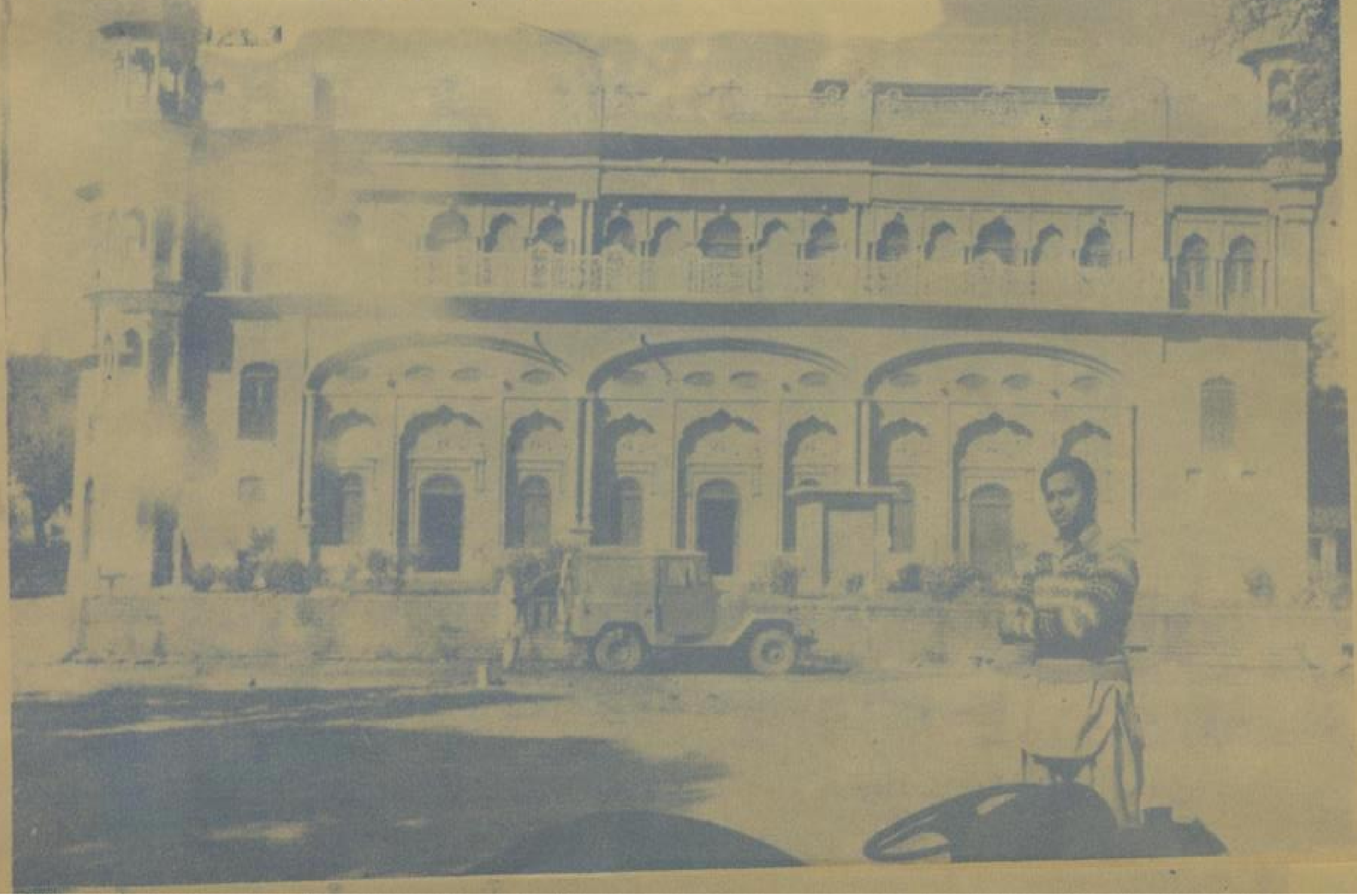

فہرست مضامین

۱ حرف اول — الف ـ ب
۲ خطہ پاک سندھ — ج ـ د
۳ مقدمہ — ۱ ـــ ۶۰

باب اول

۱ شجرۂ نسب حضرت پیر سائیں پاگارو ۶۳
۲ القابات و تاریخہائے اموات ۶۴
۳ تصوّف ۶۵
۴ تصوّف و کشف المحجوب ۶۸
۵ تصوّف کی ضرورت ۷۱
۶ تصوّف کا طریقۂ کار ۷۳
۷ شجرۂ عالیہ سلسلۂ نقشبندیہ ۷۷
۸ شجرۂ عالیہ سلسلۂ قادریہ ۷۸

باب دوم

۱ سید علی مکی کا سندھ میں ورود مسعود ۸۳
۲ تحفۃ الکرام کی روایت ۸۳
۳ جناب جی. ایم سیّد کی روایت ۸۵
۴ مرزا قلیچ بیگ کی روایت ۸۵
۵ تذکرہ صوفیائے سندھ کی روایت ۸۵
۶ تاریخی تجزیہ ۸۶
۷ آپ کی سندھ میں آمد کا مقصد ۸۸
۸ قرامطہ کا فتنہ ۸۹
۹ اس خاندان کی اہمیت ۹۲
۱۰ حضرت سیّد محمد بقا شہیدؒ ۹۴
۱۱ حضرت سیّد محمد راشد شاہ روضے دھنی ۹۵
۱۲ آپ کا بچپن ۹۶
۱۳ آپ کی تعلیم ۹۷
۱۴ طریقت کی راہ میں ۹۷
۱۵ آپ کا حلقۂ ارادت ۹۸
۱۶ وفات ۹۹
۱۷ نئی درگاہ ۹۹
۱۸ ملفوظات روضے دھنی ۹۹
۱۹ تربیت اولاد ۱۰۰
۲۰ مجاز میں کمال بے معنی ہے ۱۰۰
۲۱ سکرات میں ایمان کی سلامتی ۱۰۰
۲۲ بُری صحبت سے پرہیز ۱۰۱
۲۳ عذاب قبر سے نجات کی دعا ۱۰۱
۲۴ اولاد سے محبت ۱۰۱
۲۵ سنّت کی متابعت ۱۰۲
۲۶ آپ کے خلفا ۱۰۲

۲۷ آپ کی تصانیف	۱۰۳

باب سوم

۱ حُرّیت پسندی	۱۰۷
۲ تحریکِ مجاہدین	۱۱۰
۳ حضرت سیّد صبغت اللہ شاہ اوّل المعروف بہ پیر پاگارو نمبر ۱	۱۱۱
۴ آپکی سجادگی اور ملکی حالات	۱۱۱
۵ سندھ کی سیاسی حالت کا تفصیلی جائزہ	۱۱۲
۶ سندھ پر انگریزوں کا قبضہ	۱۱۵
۷ مسلمانوں کی زبوں حالی	۱۱۷
۸ حُریت پسندوں کی جانبازیاں	۱۱۷
۹ حضرت سیّد احمد شہیدؒ	۱۱۸
۱۰ سندھ میں حریت پسندی کی تحریک	۱۱۹
۱۱ قران السعدین	۱۱۹
۱۲ تحریکِ آزادی کیلئے لائحہ عمل	۱۲۰
۱۳ حُر جماعت کا کردار	۱۲۹
۱۴ دونوں بزرگوں کے تعلقات	۱۳۱
۱۵ پاگارو اور حر کا نقطۂ آغاز	۱۳۲
۱۶ بھیج پاگارو کا نعرہ	۱۳۵
۱۷ حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کا وصال	۱۳۵

باب چہارم

۱ حضرت سیّد صبغت اللہ شاہ اوّلؒ سے حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ تک	۱۳۵
۲ سندھ پر انگریزوں کا قبضہ	۱۴۲
۳ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور سندھ کا حصہ	۱۴۲
۴ سندھ کے حصہ لینے کی وجوہات	۱۴۴
۵ واقعات	۱۴۵
۶ انقلاب میں اہل سندھ کی شکست اور اس کے اسباب اور وجوہات	۱۴۷
۷ ناکامی کے اثرات	۱۴۹
۸ انگریزوں کے خلاف حُروں کی گوریلا جنگیں	۱۵۱
۹ پیر سید شاہ مردان شاہ اوّل	۱۵۱
۱۰ پیر سیّد شاہ مردان شاہ اوّل کی سجادگی کا معاملہ	۱۵۳
۱۱ پیر سید شاہ مردان شاہ اول کا پُر آشوب دور	۱۵۳
۱۲ بچو فقیر کی ناکامی	۱۵۵
۱۳ بچو فقیر اور کُتب تاریخ سندھ	۱۵۶
۱۴ شارح کا فٹ نوٹ	۱۵۷
۱۵ حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ اور سندھ کا تاریخی اور سیاسی پس منظر	۱۵۸
۱۶ پہلی جنگ عظیم	۱۵۸

باب پنجم

۱ حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی شہید ۱۶۵
۲ برصغیر کی سیاسی حالت اور تحریک ہوم رول ۱۶۸
۳ رولٹ ایکٹ ۱۶۹
۴ تحریک خلافت و ہجرت ۱۶۹
۵ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی ۱۷۱
۶ صوبہ سندھ اور تحریک آزادی پاکستان ۱۷۳
۷ مسجد منزل گاہ ۱۷۴
۸ پیر سید صبغت اللہ شاہ کی جیل سے رہائی اور سندھ میں واپسی ۱۷۶
۹ ابتلا کا دور اور آپ کا استقلال ۱۸۲
۱۰ پیر صاحب پر مقدمہ اور اس کا نتیجہ ۱۸۴
۱۱ پیر صاحب کی ذاتی زندگی ۱۸۹
۱۲ دشمنوں کی چیرہ دستیاں ۱۹۰
۱۳ حضرت شہید کی جدوجہد کا ایک جائزہ ۱۹۲
۱۴ مرشد اور مرید ۱۹۷

باب ششم

۱ پیر شہید اور ایچ۔ ٹی لیمبرک ۲۰۳

باب ہفتم

۱ علمی ادبی اور دینی خدمات ۲۱۷
۲ حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ اول ۲۱۸
۳ حضرت پیر سید علی گوہر شاہ اصغر ۲۱۹
۴ حضرت پیر سید حزب اللہ شاہ ۲۲۰
۵ حضرت پیر سید شاہ مردان شاہ اول ۲۲۳
۶ حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی (شہید) ۲۲۶
۷ روحانی اور عسکری خدمات ۲۲۸

باب ہشتم

۱ آغاز سخن ۲۳۳
۲ حضرت پیر سکندر شاہ الملقب بہ پیر شاہ مردان شاہ ثانی ۲۳۴
۳ آپ کے ابتدائی حالات ۲۳۸
۴ حضرت شہید کی شہادت کے بعد ۲۴۰
۵ انگلینڈ میں آپ کی نظر بندی ۲۴۱
۶ قیام پاکستان کے بعد ۲۴۱
۷ وطن واپسی کے بعد ۲۴۳
۸ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک و ہند جنگیں ۲۴۴
۹ جنگی خدمات ۲۴۵
۱۰ پیر صاحب کی امن پسندی ۲۵۲
۱۱ ڈاکوؤں سے مقابلے ۲۵۳
۱۲ لسانی فسادات ۲۵۶
۱۳ دینی خدمات ۲۵۸
۱۴ پیر صاحب کی موجودہ زندگی ۲۶۹
۱۵ حوالہ جات کی کتابیں ۲۷۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ اوّل

تاریخ سندھ کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بارہا یہ خیال آیا کہ داستانِ حرّیت کے مختلف ابواب کو یکجا کر کے اہلِ پاکستان کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ قیامِ پاکستان کے پسِ منظر سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان تمام بزرگوں کے کارناموں کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ جنہوں نے مدّتوں پہلے اس کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے پچیس سال بعد تک بھی کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ اپنے اسلاف کے محیّر العقول کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرایا جائے تاکہ وہ مغرب پرستی کی وبا سے آزاد ہو کر تعمیرِ سیرت اور جذبۂ حرّیت کے لئے اپنے آباؤ اجداد کے نقوش قدم پر گامزن ہوں۔ کیونکہ دینی اور دنیاوی سعادتوں کے حصول کی راہ میں جد وجہد کرتے ہوئے۔ ان کے نقوشِ پا اس قدر واضح اور اَن مٹ ہیں۔ کہ رہرو کے بھٹکنے کا کوئی خدشہ ہی باقی نہیں رہتا۔

سرزمین سندھ نے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے اَن گنت بزرگوں کو اپنی آغوش میں پروان چڑھایا ہے کہ نام نہاد لیڈر ان عظیم المرتبت ہستیوں کی خاکِ پا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ملّت کے ان چاند ستاروں کی طویل جدوجہد سے نونہالانِ

قوم کو روشناس کرایا جائے تو آج بھی وہ ان کے حیرت انگیز نتائج سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ اگر ان بزرگوں کے تجربات۔ مشاہدات اور ارشادات کے سرچشمے ہماری اجتماعی بہبود۔ سیرت کی تعمیر اور غور و فکر کا مرکز بن جائیں تو اکنافِ عالم میں ہماری دھوم مچ جائے۔ اور اقوامِ عالم پر ہمارا دبدبہ طاری ہو جائے۔

تجدید و احیائے دین اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی کوششوں کے سلسلہ میں ہم آپ کی خدمت میں سرزمین سندھ کے ایک ایسے خاندان کا تذکرہ پیش کر رہے ہیں جو جہدِ مسلسل۔ عملِ پیہم اور سرچشمۂ رشد و ہدایت کی حیثیت سے تاریخ سندھ میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے جو بیک وقت روحانی اور عسکری قوتوں کا حسین امتزاج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں آج تک زندہ و تابندہ ہے۔ اس خاندان کے فیوضات و انوار کی پہلی کرن آج سے تقریباً ایک ہزار سال پیشتر اس سرزمین پر ضوفگن ہوئی اور اس وقت سے لیکر آج تک علم و عرفان۔ ایثار و قربانی اور عملی جہاد کے چراغ مسلسل روشن کرتی رہی۔

اس خاندان کی داستان کبھی مسجد و محراب اور مدرسہ و خانقاہ کے در و دریچے کے خوشنما نقوش سے مزین دکھائی دیتی ہے اور کبھی شمشیر و سناں اور دار و رسن کی خونی لکیروں سے منقش نظر آتی ہے۔ یہ خاندان حضرت پیر صاحب پاگارہ کا وہ جلیل القدر خانوادہ ہے جو حضرت سیّد علی لکیاری کے ورود سندھ سے لیکر آج تک اس سرزمین میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے ہی بزرگوں کے لئے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کہیں مدّت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

خطّۂ پاکِ سندھ

برّصغیر ہند و پاک میں بلا شبہ یہ فخر صرف خطّۂ پاک سندھ کو حاصل ہے کہ اسلام کی روشنی اسی راستے سے اس ملک میں پھیلی ۔ باب الاسلام کی یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس نے بقول بعض مورخین صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعین اور تبع تابعین کے قدم چومے اور مجاہد اعظم حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے لشکر میں تو بہت سے تابعین اور تبع تابعین بھی موجود تھے ۔ جن کے مقدس جسم اسی خاک میں مدفون ہیں ۔ یہاں لشکرِ اسلام کے مبارک قدموں کے انمٹ نقوش اب تک قدیم کھنڈرات کی صورت میں دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں ۔

نخلِ عرب ۔ کھجور ۔۔ ان مجاہدوں کی نہایت شیریں یادگار اس سرزمین کے اکثر و بیشتر حصّوں میں جلوہ فگن ہے ۔

صوفی شعرا حضرت شاہ عبداللطیف ۔ حضرت سچل سرمست اور حضرت لعل شہباز قلندر (رحمہم اللہ اجمعین) کے نغموں سے گونجنے والی یہ سرزمین ہمیشہ امن و آشتی کا گہوارہ رہی ہے ۔ حضرت شیخ عبدالرحیم گرہوڑی کی پیش گوئیاں آج بھی اس سرزمین میں زبانِ زدِ عام ہیں ۔

اپنی قدامت اور تہذیب و ثقافت کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اپنی موجودہ معیشت و معاشرت اور زراعت و کاشت کی بوقلمونیوں سے حد درجہ جاذبِ نظر ہے اور یہ اسی جذب کا لازمی کرشمہ ہے کہ بے شمار قومیں باہر سے یہاں وارد ہوئیں اور اسی خطّۂ پاک کا ایک ناقابلِ تقسیم جزو بن کر رہ گئیں ۔ لیکن اس کے جذب و دعوت میں کوئی کمی نہ ہوئی ۔ جو بھی اِس خطّۂ پاک میں آیا ۔ اس نے یہاں آکر ہمیشہ سکون محسوس کیا ۔ کیونکہ یہاں کے گل و گلزار سے بزرگانِ دین کے فیوضات کی خوشبو آتی ہے اور مرغانِ چمن کے نغمے ان مقدس ہستیوں کے پیامِ محبت کے آئینہ دار ہیں ۔

علما۔ صوفیا۔ اصدقا۔ اور شہدا کا یہ گروہ ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ان کے تذکروں سے دل کی ویران دنیا آباد کریں۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص جس گروہ سے محبت رکھتا ہے۔ حشر کے روز اُسی گروہ کے ساتھ ہو گا۔"

ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش ان بزرگوں کے حضور میں نذرانۂ عقیدت ہے ؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف

یکم ستمبر ۱۹۷۳ء
دو شعبان ۱۳۹۳ھ

احقر العباد
تبسم چودھری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حدیثِ عشق و سرمستی زمن بشنو، نہ از حافظ
کہ با جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم

"**سندھ صوفیوں کا دیس**" یہ کہاوت تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ جب سے یہ خطہ اسلام کے نور سے منور ہوا ہے اور اُسے "باب الاسلام" کے خطاب سے نوازا گیا ہے، یہاں اہلِ علم و عرفان کی ہمیشہ کثرت رہی ہے۔ یہ سلسلہ قرنِ اول سے لیکر انگریز کی آمد تک جاری رہا۔ انگریز کے تسلط کے بعد بھی سندھ علما و اولیا کے وجود اور ان کے فیوض و برکات سے خالی تو نہیں ہوا لیکن ان نفوسِ قدسیہ کی وہ کثرت جو برطانوی دور سے پہلے تھی اس میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہونے لگی۔

برطانوی دور سے پہلے سندھ کا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں علمائے کرام اور اولیائے عظام سے معمور تھا اور ان کے ظاہری و باطنی فیضان سے یہاں کا ہر فرد بیرونی حملوں خونیں انقلابات اور طوائف الملوکی کے تباہ کن اثرات کے باوجود خدا سے لَو لگائے ہوئے تھا اور سندھ کا گوشہ گوشہ نغمۂ توحید سے گونجتا رہتا۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس ایمان افروز دور میں سندھ کے کئی شہروں میں بیک وقت علم و عرفان کے متعدد مراکز قائم تھے۔ سینکڑوں علما اور بیسیوں اولیا طالبانِ حق کو علوم دین کی تعلیم اور تزکیۂ نفس کی تربیت دینے میں منہمک رہتے اور ان کی توجہ سے سندھ کا چپہ چپہ بلکہ اس کے جنگل اور پہاڑ اور دشت و بیاباں بھی ایمان اور اسلام کی

ضیا باریوں سے جگمگاتے رہتے۔

علماء و اولیا کے یہ گروہ صرف مقامی باشندوں پر ہی مشتمل نہیں تھے، بلکہ عالمِ اسلام کے اطراف و اکناف سے بھی اہلِ علم و عرفان اپنے پیشوایان کے احکام و ہدایات پر یا براہِ راست دربارِ رسالت سے اشارہ پاکر وقتاً فوقتاً سندھ میں وارد ہوتے اپنے ماضی سے مادی تعلقات توڑ کر یہیں مستقل بود و باش اختیار کر لیتے اور بندگانِ خدا کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہو جاتے تھے۔

سیّد علی مکّی

زیرِ نظر کتاب جس برگزیدہ اور قابلِ احترام خاندان کے حالات پر مشتمل ہے، اس کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید علی مکّی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی اولین مشائخ کبار میں سے ہیں جو ایک ہزار برس قبل خلفائے بنی عباس کے عہد حکومت میں اشاعتِ اسلام کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے سندھ میں وارد ہوئے حضرت سید علی مکی کا سلسلۂ نسب پندرھویں پشت میں امام عالی مقام سید الشہدا حضرت حسین علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

اس برصغیر میں بعض مشائخ کی آمد کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایران، توران اور وسط ایشیا کے بیشتر ممالک میں سیاسی خلفشار، تاتاریوں کی پے در پے یلغاروں اور بے انتہا مظالم سے امن قائم نہیں رہا تھا اور شریف و نجیب اور اہلِ علم و فضل لوگوں کا جینا دو بھر ہو گیا تھا۔ لیکن سید علی مکی چونکہ مکہ معظمہ سے آئے تھے اور ایسے دور میں آئے تھے، جب ان فتنوں نے سر نہیں اٹھایا تھا اور بعد میں بھی ارضِ حجاز میں ان سفاک حملہ آوروں کا گذر نہیں ہوا، لہٰذا ان کی آمد بلغوا عنی ولو آیہ کے ارشاد کے تحت محض تبلیغ دین اور رشد و ہدایت ہی کے لئے ہو سکتی ہے۔

پاگارہ خاندان

سید علی مکی نے اپنے دور میں تبلیغ دین کے سلسلہ میں جس جہد و عمل کی بنیاد رکھی تھی اس کو ان کی اولاد نے جاری رکھا اور بہت بعد میں ان کی نسل سے پیدا ہونے والے پاگارہ خاندان نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

اس خاندان میں دیگر مشائخ عظام کی بہ نسبت جو امتیازی خصوصیت رہی ہے

وہ یہ ہے کہ دیگر مشائخ نے باب الاسلام سندھ اور برصغیر پاک وہند کے باشندگان کو توحید سے آشنا کیا۔ علم وعرفان کی تعلیم وتربیت دی اور دین کے رموز واسرار سے آگاہ کیا۔ لیکن پاگارہ خاندان کے جلیل القدر اور عظیم المرتبت مشائخ نے لاکھوں انسانوں کو صرف ظاہری وباطنی فیضان سے سیراب کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کے تقاضوں کو مکمل کرنے کے لئے جب بھی اور جہاں بھی ضرورت ہوئی جہاد بالسیف سے بھی کام لیا۔ احیاء دین ہو یا حملۂ کفار سے وطن کے دفاع کی مہم، اس خاندان نے کبھی جان ومال کی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور جب بھی من انصاری الی اللہ کی صدا بلند ہوئی یہ خاندان نحن انصار اللہ کہتا ہوا سب سے اول سربکف اور کفن بردوش میدانِ جہاد میں پہنچا۔ مردانگی اور شجاعت کا حق ادا کیا۔ اللہ کے نام پر بے دریغ متاعِ جان قربان کیا اور فتح ونصرت کے پرچم لہراتا ہوا سرخرو وسربلند ہو کر لوٹا۔

پاگارہ خاندان کا یہ طریقۂ کار حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ کار کے عین مطابق ہے حضور نے تبلیغ دین کے سلسلہ میں حسب ضرورت دونوں طریقے اختیار فرمائے ہیں۔ بعثت کے بعد حضور کی مکی زندگی کے تیرہ سال اشاعت اسلام اور صحابہ کرام کی سیرت وکردار کے سنوارنے میں گذرے اور مدنی زندگی کے دس سال اشاعت اسلام اور تہذیب اخلاق کے ساتھ ساتھ زیادہ تر جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوئے۔ پاگارہ خاندان کا یہ وطیرہ حضور کی زندگی کے دونوں پہلوؤں کا آئینہ دار ہے اور دیگر مشائخ کی بہ نسبت جہاد فی سبیل اللہ اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

پاگارہ خاندان نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کے مشترک اور مسلسل عمل کا وطیرہ جو اس خاندان نے اختیار کیا ہے، برصغیر پاک وہند کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

پاگارہ خاندان کی تبلیغی سرگرمیاں صرف سندھ، بلوچستان اور بہاولپور تک محدود نہیں رہیں، بلکہ گجرات، کچھ، کاٹھیاواڑ اور راجستھان کے وسیع ترین علاقے

تک پھیل گئیں جس میں جیپور، جودھپور، جیسلمیر اور بیکانیر وغیرہ شامل ہیں۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق اس خاندان کے مشائخ کی تبلیغی کوششوں سے کم از کم دس لاکھ غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے بیشمار لوگ ان کے دستِ حق پرست پر تائب ہو کر راہِ ہدایت پانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت راجستھان میں ان کے مریدوں کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہے اور پاکستان میں سولہ لاکھ۔ اور یہ مرید (حُر) رسمی مرید نہیں ہیں بلکہ تمام کے تمام انتہا درجے کے پُرخلوص عقیدت مند، فداکار اور جاں نثار ہیں۔ ان کی فداکاری اور جاں نثاری کے واقعات بیان کئے جائیں تو جو لوگ ذاتی طور پر ان حقائق سے آگاہ نہیں ہیں وہ انہیں افسانے خیال کریں گے۔

پاگارہ خاندان کے متبعین

اس خاندان سے فیض یافتہ بزرگواروں میں سے متعدد حضرات اپنے دور کے نامور مشائخ گذرے ہیں، مثلاً سوئی شریف، بھرچونڈی شریف، امروٹ شریف اور دین پور شریف وغیرہ خانقاہوں کے سجادہ نشین صاحبان۔ ان حضرات نے بھی اپنے پیرانِ طریقت کے نقشِ قدم پر چلکر اپنے آپ کو احیاءِ دین اور رشد و ہدایت کے لئے وقف کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو ظاہری و باطنی فیض سے مستفیض فرمایا۔ ان میں سے امروٹ شریف کے خلیفہ اور ان کے پیرووں نے انگریز کے خلاف جنگ آزادی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ علم و عرفان کے ان مراکز سے متعدد شاخیں پھوٹیں جو سندھ کے گوشہ گوشہ میں اور بیرونِ سندھ میں بھی پھیل گئیں یہ تمام مراکز اور ان کی شاخیں قائم ہیں اور اپنے مشائخ کی جانب سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ ان مراکز اور ان کی تمام شاخوں کا اصل مرکز پیر گوٹھ ہے

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

یہ تمام مشائخ اور روحانی رہنما جب اپنے پیر طریقت حضرت پیر پاگارو کی خدمت اقدس میں حاضری دینے آتے ہیں تو ادب و احترام کی خاطر پیر گوٹھ کی حدود میں ننگے پاؤں

داخل ہوتے ہیں اور عقیدت سے شہر میں سر جھکائے چلتے ہیں۔

تذکرہ نویسی سے گریز

افسوس اس بات کا ہے کہ پاگارہ خاندان جو سوا سو سال سے تبلیغ اسلام اور احیائے دین کا مرکز و محور ہے، رشد و ہدایت اور فیوض و برکات کا سرچشمہ اور جہاد آزادی کا علمبردار رہا ہے اسکی کوئی مبسوط تاریخ نہیں لکھی گئی اور اسکی دینی اور وطنی خدمات کا کسی مستقل اور مستند تصنیف کے ذریعہ مفصل ذکر نہیں کیا گیا۔ اسکی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ چونکہ اس خاندان کی سرگرمیاں برطانوی حکومت کی پالیسوں سے متصادم رہی ہیں اور برطانوی حکومت احیائے دین اور جنگ آزادی کی تحریکوں کی وجہ سے اس خاندان کو ہمیشہ شبہہ اور خوف کی نظر سے دیکھتی رہی ہے، لہٰذا کوئی مؤرخ اور اہل قلم یہ جسارت نہیں کر سکا کہ اس خاندان کے حالات قلمبند کرے اور اس کے کارناموں کو اُجاگر کر کے حکومت وقت کا معتوب بنے۔ حق بات کہنا بہت مشکل ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے۔ ماضی میں بھی یہی ہوتا رہا ہے اور حال میں بھی یہی ہوتا رہا ہے۔ بعض تصانیف میں اس خاندان کی دینی اور وطنی خدمات پر روشنی ضرور ڈالی گئی ہے لیکن یا تو انتہائی اختصار کے ساتھ یا افسانوی انداز میں۔ تاریخی اعتبار سے اگر کسی اہلِ قلم نے اس خاندان کا تعارف کرایا ہے تو اس میں حکومت کے ایما اور منشا کا دخل رہا ہے اور لکھنے والے کے دل میں حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نہ قلم کی آبرو قائم رہتی ہے اور نہ ضمیر کی خلش کی پرواہ کی جاتی ہے۔ ایسی تحریروں سے جہاں لکھنے والے کا خبث باطن جھلکنے لگتا ہے اور اس کے ہر حرف سے بد دیانتی کی بو آتی ہے، وہاں وہ ہاتھ بھی زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو پسِ پردہ لکھنے والے کی پشت پر ہوتا ہے

اس سلسلہ میں مثال کے طور پر خان بہادر خداداد خان کی تصنیف "لُبِ تاریخ سندھ" اور ایچ۔ ٹی۔ لیمبرک کی تازہ ترین کتاب "دہشت پسند" (THE TERRORIST) کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لب تاریخ کے مصنف برطانوی حکومت کے نمک خوار تھے انہوں نے حق نمک ادا کرنے کے لئے یا حکومت کے ایما پر اس خاندان اور اسکی جماعت

(حُروں) کے خلاف خود ساختہ اور بے سرو پا بہتان طرازیوں سے کام لیکر خبثِ باطن کا اظہار کیا اور اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔ دہشت پسند کے مصنف تو ہیں ہی انگریز جو اس خاندان کو اور اسکی جماعت (حُر) کو اپنے قومی اقتدار کے لئے ہمیشہ خطرہ سمجھتا رہا اور یہ خاندان اور اسکی جماعت (حُر) انگریز کو دین اور وطن کا دشمن سمجھتے ہوئے شروع سے آخر تک اور لیمبرک کی آنکھوں کے سامنے اس سے برسرپیکار رہے۔

ان حالات میں دونوں مصنفین سے یہ امید کیسے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ پاگارہ خاندان سے انصاف کریں گے اور اسکی جماعت (حُروں) پر تہمت تراشیوں سے احتراز کرتے ہوئے ان کے مجاہدانہ کردار کی عکاسی کرینگے۔ خداداد اور لیمبرکِ کے ہمنوا ایک دو اہل قلم اور بھی ہیں جن کی شکلیں اس کتاب کے آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

پہلی کوشش

زیرِ نظر کتاب "تذکرۂ پیرانِ پاگارہ" پہلی تصنیف ہے جسے ایک غیر جانبدار اور دیانت دار اہلِ قلم نے مرتب کیا ہے اور جسمیں پاگارہ خاندان اور اس کی جماعت (حُروں) کے صحیح حالات پیش کئے ہیں اور ان کی دینی اور وطنی خدمات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تصنیف مختصر ہونے کی بنا پر جامع تو نہیں کہی جاسکتی لیکن صحت کے اعتبار سے مستند ضرور کہی جاسکتی ہے اس کتاب کو واقعات کی صحت اور مصنف کی دیانت کی بنا پر قارئین کرام کے سامنے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے اور بجا طور پر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ انگریز اہل قلم اور انگریزی حکومت کے نمک خوار مصنفین نے پاگارہ خاندان اور اس کی جماعت کے خدوخال بگاڑنے کی جو مذموم کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے اس کی بڑی حد تک تلافی ہوجائے گی اور خود غرض اور بد اندیش اہل قلم کی افترا پردازیوں کا بھرم ایک بے غرض اور منصف مزاج مؤرخ کی محققانہ کاوشوں سے کھل جائیگا۔

خوش بود گر محک تجربہ آید بہ میاں
تا سیہ روئے شود ہر کہ در وغش باشد

تذکرۂ پیران پاگارہ کے مصنف نے پاگارہ خاندان کی تاریخ کو ایک حقیقت پسند

مؤرخ کی حیثیت سے قلمبند کیا ہے۔ حقائق پیش کرنے میں اجمال اور اختصار کے باوجود بڑی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ ہر روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ہر واقعہ کو مستند و معتبر حوالہ جات اور قطعی دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا ہے مصنف نے اس خاندان کی سوا سو سالہ دینی اور عسکری خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس تمام تر جدوجہد کا منتہائے مقصود بھی پوشیدہ رہنے نہیں دیا یعنی حکومتِ الٰہیہ کا قیام۔ اس کے علاوہ مصنف نے حُر جماعت کا تعارف کراتے اور اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان الزامات کے بھی معقول اور مدلل جوابات دیئے ہیں جو اس کے خلاف انگریز اور اس کے خانہ زادوں نے تراشے ہیں۔ لیکن یہ تذکرہ چونکہ ایک مختصر سی تصنیف ہے اور پاگارہ خاندان اور حر جماعت کے تعارف کی ابتدائی کوشش لہٰذا اس میں انکی دینی خدمات اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیلات درج نہیں ہو سکیں اور نہ ہی مخالفین کے تمام الزامات کے جوابات کی گنجائش پیدا کی جا سکی۔ اس کے باوجود مصنف نے پیش کردہ حقائق اور واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ :-

(الف) پاگارہ خاندان برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا بہت بڑا مبلغ رہا ہے اور اسی خاندان کی سوا سو سالہ تاریخ دینی خدمات کے ساتھ ساتھ عسکری کارناموں سے بھی معمور ہے۔

(ب) اس خاندان نے اپنی جماعت کو صحیح اسلامی خطوط پر استوار کیا اور اس میں مجاہدانہ جذبہ پیدا کیا۔

(ج) یہ خاندان ہمیشہ غیر اسلامی قوتوں کا مخالف اور ان سے متصادم رہا ہے

(د) اور آج بھی یہی خاندان اور اسکی جماعت ہے جو اسلامی اخوت کے علمبردار اور قومی اتحاد کے پاسبان ہیں اور ملک کی نظریاتی خواہ علاقائی سرحدات کی حفاظت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

دین کا صحیح مفہوم

اسلام صرف صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کا مذہب نہیں ہے، بلکہ عقائد، عبادت اور معاملات پر مشتمل ایک ضابطہ

یات ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ایک مکمل نظام۔ اسلام انسانی زندگی
تقسیم نہیں کرتا اور دین کو سیاست سے الگ نہیں سمجھتا۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں
ایک ایسے نظام کے تحت لانا چاہتا ہے جس کا ماخذ قرآن و سنت ہو یعنی زندگی کا ہر
یہ اللہ کے منشا کا مظہر اور حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کا
نہ ہو۔ یہ نظام جسے عرف عام میں اسلامی معاشرہ کہا جاتا ہے۔ حضور کا تشکیل کردہ
ام ہے جسے حضور نے خود اپنے دور میں چلایا اور حضور کے بعد خلفائے راشدین نے
ہائی کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھایا۔ اسلام چونکہ اللہ کا پسندیدہ دین ہے اور حضور
ترتیب دیا ہوا نظام اللہ کے منشاء کے عین مطابق اور دین اسلام کے زرین اصولوں
نی ہے۔ لہٰذا امتِ محمدی کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حضور کے
ئے ہوئے نظام کا اتباع کرے اور اسے قائم رکھنے کے لئے ہر امکانی تدبیر عمل میں
ئے۔ افراد کی بہ نسبت یہ ذمہ داری دینی اداروں اور روحانی مرکزوں پر اور بھی زیادہ
ہوتی ہے کہ وہ اپنے متبعین کو اس پر چلنے کی تلقین کریں اور اس کے بقا و دوام کے
ہر آن اور ہر حال میں مستعد رہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ اسلام اور احیائے دین کے ہزاروں مرکز قائم ہوئے
ن ان میں سے چند مرکز ہی ایسے نکلے جنہوں نے حکومت الٰہیہ اور نظام مصطفےٰ کے
کے لئے جد و جہد کی۔ پاگارہ خاندان ان چند دینی اور روحانی مرکزوں میں سے
ہم ترین مرکز ہے جس کے پیش نظر تبلیغ اسلام اور احیائے دین کا اصل مدعا
ا حکومت الٰہیہ اور نظام مصطفےٰ کا قیام رہا ہے۔ اس خاندان نے اس مقصد
سول کے لئے اسلام دشمن قوتوں کا قلع قمع ضروری سمجھا اور اس ضرورت کی تکمیل
ُ چونکہ جان و مال کی قربانی لازمی ہے۔ لہٰذا اس خاندان نے کبھی اس سے دریغ
یا۔

وایانِ دین کی خدمات

مسلمانوں نے اس برصغیر پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکمرانی کی لیکن کسی مسلمان حکمران نے

تبلیغ اسلام کے لئے مستحکم بنیادوں پر کوئی منظم تحریک نہیں چلائی اور نہ ہی اسلامی نظام کے قیام کے لئے کوشش کی۔ آج اگر برصغیر پاک و ہند میں کروڑوں مسلمان نظر آتے ہیں اور محمد عربی کا سدا بہار چمن پھلا پھولا اور سرسبز و شاداب دکھائی دیتا ہے تو یہ علماء کرام اور اولیائے عظام کی تبلیغی سرگرمیوں اور رشد و ہدایت کے طفیل ہے اور یہ بھی ان ہی مشائخ کے دینی اور روحانی مرکزوں سے جاری کردہ تحریکوں کا صدقہ ہے کہ اس برصغیر میں پاکستان کے نام سے ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی ہے۔ اگرچہ پاکستان کا وجود بظاہر ایک سیاسی عمل کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحصل اس کے پس پشت اسلامی تحریک ہی ایک ایسی قوت تھی جس نے اس سیاسی عمل میں جان پیدا کی اور اسکو وجود بخشا۔

پاگارہ خاندان کا تحریک اسلامی کی اس زندگی بخش اور روح پرور قوت میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ بعد میں جب پاکستان وجود میں آیا تو اس وقت سے لیکر آج تک اس خاندان کی یہی قوت ملک کی نظریاتی اور علاقائی سرحدات کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی رہی ہے۔

تذکرۂ پیران پاگارہ کے مصنف نے پاگارہ خاندان کی ان ہی خدمات کا ذکر اختصار کے ساتھ لیکن بلیغ انداز میں کیا ہے۔

وجہ تالیف

یہ تذکرہ اگرچہ ایک مختصر سی تاریخ ہے لیکن ایک تاریخی کتاب کی تالیف و تدوین کے اصولوں کے پیش نظر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس تذکرہ کی سب سے بڑی خوبی ہے مصنف کا جذبہ خلوص۔ ان کی غیر جانبداری اور دیانتداری اور تاریخی واقعات کی تحقیق و صحت۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی زبان کا بے ساختہ استعمال۔ جس کی رنگینی اور دلکشی ذوق سلیم کو تسکین بخشتی ہے اور قلب و روح میں تازگی اور بالیدگی پیدا کرتی ہے۔ مصنف نے موضوعات کے انتخاب، مضامین کی ترتیب اور بحث و تبصرہ کا محققانہ انداز اختیار کرنے میں جس ذہانت، مہارت اور غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے صلہ میں اگر ان کو خراج تحسین پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے تو یہ ایک رسمی سا تکلف ہوگا اور اس سے

مصنف کے علمی و فنی کمال اور ان کی بے انتہا صلاحیتوں اور لیاقتوں کا کما حقہ اظہار نہیں ہو سکے گا - لہٰذا

آفتاب آمد دلیل آفتاب

کے اصول کے پیش نظر یہ تذکرہ ہی ان کی بے پایاں خوبیوں پر شاہد عدل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اہل علم و دانش کی نگاہ میں ایک متن متین کی حیثیت رکھتا ہے ۔

مصنف نے ان کتب کی فہرست پیش کرنے کے بعد جنہیں انہوں نے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے ، تذکرہ کی ابتدا "حرف اول" سے کی ہے جسمیں وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :-

"مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ داستانِ حریت کے مختلف ابواب کو یکجا کر کے اہلِ پاکستان کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ قیام پاکستان کے پسِ منظر سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان تمام بزرگوں کے کارناموں کی ایک جھلک دیکھ سکیں جنہوں نے مدتوں پہلے اس کے لئے راہ ہموار کی تھی ....

سرزمین سندھ نے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے ان گنت بزرگوں کو اپنی آغوش میں پروان چڑھایا ہے کہ نام نہاد لیڈران عظیم المرتبت ہستیوں کی خاک پا تک نہیں پہنچ سکتے . اگر ملّت کے ان چاند ستاروں کی طویل جد و جہد سے نونہالان قوم کو روشناس کرایا جائے تو آج بھی وہ ان کے حیرت انگیز نتائج سے مستفید ہو سکتے ہیں ......

تجدید و احیائے دین اور قیام حکومتِ الٰہیہ کی کوششوں کے سلسلہ میں ہم آپ کی خدمت میں سرزمین سندھ کے ایک ایسے خاندان کا تذکرہ پیش کر رہے ہیں . جو جہد مسلسل ، عمل پیہم اور سرچشمۂ رشد و ہدایت کی حیثیت سے تاریخ سندھ میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے جو بیک وقت روحانی اور عسکری قوتوں کا حسین امتزاج ہونے کے ساتھ ساتھ

ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں آجتک زندہ وتابندہ ہے.....

اس خاندان کی داستان کبھی مسجد ومحراب اور مدرسہ وخانقاہ کے درودریچہ کے خوشنما نقوش سے مزین دکھائی دیتی ہے اور کبھی شمشیر وسناں اور دار ورسن کی خونین لکیروں سے منقش نظر آتی ہے۔ یہ خاندان حضرت پیر صاحب پاگارہ کا وہ جلیل القدر خانوادہ ہے جو حضرت سید علی مکی لکیاری کے ورود سندھ سے لیکر آج تک اس سرزمین میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے.......

مصنف نے حرف اول کے بعد "خطۂ پاک سندھ" کے عنوان کے تحت اس سرزمین کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔

برصغیر ہند وپاک میں بلاشبہ یہ فخر صرف خطۂ پاک سندھ کو حاصل ہے کہ اسلام کی روشنی اسی راستے سے ملک میں پھیلی۔ باب الاسلام کی یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس نے بقول بعض مؤرخین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قدم چومے.........

تذکرہ کے مندرجات

تذکرہ پاگارہ خاندان کے تعارف اور انکی سات پشتوں کی مناسبت سے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول پاگارہ خاندان کے شجرۂ نسب سے شروع کیا گیا ہے اور اس میں اس خاندان کے مشائخ کے القاب اور ان کی تاریخہائے وفات کے بعد "تصوّف" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ ہے جس میں تصوّف کی ضرورت اور اس کے طریقۂ کار پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "دینیات" اور حضرت سید علی ہجویری کی "کشف المحجوب" کے اقتباسات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے جو اس موضوع پر اپنے معانی ومفاہیم کے اعتبار سے ایک جامع اور سنجیدہ بحث ہے۔ اس کے بعد تصوّف کے مشہور چار سلسلوں (۱) نقشبندیہ (۲) قادریہ (۳) سہروردیہ اور (۴) چشتیہ کا مختصر تعارف کراتے ہوئے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے مفصّل شجرے پیش کئے ہیں۔ جن سے پاگارہ خاندان کے مشائخ

منسلک ہیں۔

باب دوم پاگارہ خاندان کے جد امجد حضرت سید علی مکیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے ورود سندھ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے ورود مسعود کے سلسلہ میں مختلف روایات کا تجزیہ کرنے اور ان کی علمی اور دینی خدمات بیان کرنے کے بعد پاگارہ خاندان سے پہلے ان کی اولاد میں جو نامور اور بزرگ شخصیتیں گذری ہیں، مختصر طور پر ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ پاگارہ خاندان کے بانی حضرت سید محمد راشد روضے دھنی اور اس سے پہلے ان کے والد ماجد حضرت سید محمد بقا شہید رحمۃ اللہ علیہما کا ذکر بھی اسی باب میں ہے جو حضرت سید علی مکیؒ کی بیسویں پشت میں ہیں۔

حضرت روضے دھنی کے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:-

(۱) حضرت سید محمد بقا نے حضرت سید محمد راشد کو اپنے مرشد حضرت مخدوم محمد اسماعیل کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی تو حضرت مخدوم صاحب نے فرمایا "بہت اچھے ہونگے" اور "یہ وہ مبارک روح ہے جس سے دنیا کا بہت بڑا حصہ فیضیاب ہوگا"

اس ارشاد کے بعد بار بار آپ کے لئے دعا کی اور مستقبل کے واقعات نے حضرت مخدوم صاحب کی دونوں پیشین گوئیاں درست ثابت کردیں

(۲) آپ نے اپنی پیدائش کے بعد پہلے رمضان میں اپنی والدہ کا دودھ پینا چھوڑ دیا تھا۔

(۳) آپ فرماتے ہیں کہ بچپن میں ہمارے دل میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ ہم عارف کامل ہو جائیں اور صاحب ارشاد و تلقین ہو کر دوسروں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کریں اور خود تجلیات و انوار کے کیف و سرور سے وجد کرتے رہیں۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پیدائشی ولی تھے بچپن ہی سے آپ کا رجحان عرفان الٰہی، تقرب الی اللہ اور بندگان خدا کے لئے رشد وہدایات

اور فیض رسانی کی جانب تھا۔ اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جب سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ تو ذکر جہر کی مشق سے ان کے ہر بُن مُو سے ذکر جاری ہو گیا۔ اور تھوڑے عرصہ کے اندر انوار و تجلیات کی بارش ہونے لگی۔

حضرت روضے دھنی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم، تربیت، بیعت، روحانی مدارج، حلقۂ ارادت، خلفاء، ملفوظات اور تصانیف پر یہ باب ختم ہوتا ہے۔

باب سوم حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کے حالات پر مشتمل ہے جنہوں نے تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ دین اور وطن کے تحفظ کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کیا۔

مصنف نے اس باب کی ابتدا میں "حریت پسندی" کے عنوان کے تحت رقم فرمایا ہے کہ

> آئندہ ابواب میں اس خاندان کے ان جانبازوں کا تذکرہ ہو گا جنہوں نے قیام حکومت الہٰیہ کی خاطر جانیں لڑا دیں اور حریت پسندی کی روح پھونک کر ناخواندہ قوم کے جسد بے جان میں زندگی کی لہر دوڑا دی جن کے ایک اشارۂ ابرو پر سینکڑوں مردانِ حُر تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھ گئے اور کئی خاندانوں کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو گئیں۔

اس اظہار خیال کے بعد مولانا غلام رسول مہر کی تصنیف "سرگذشت مجاہدین" کا ایک طویل اقتباس پیش کیا گیا ہے جسمیں مہر صاحب نے ان غازیوں اور مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جنہوں نے برصغیر میں مسلم حکومت کے زوال کے بعد انحطاط، مایوسی اور دار و گیر کے سخت اور مشکل ترین دور میں بھی شمع حریت کو روشن رکھا اور اپنے جذبۂ خلوص کو کبھی کسی دنیوی منفعت۔ حتیٰ کہ کلمہ تحسین کی تمنا سے بھی ملوث ہونے نہیں دیا۔

مجاہد اوّل

باز گو از نجد و از یاران نجد ✤ تا در و دیوار را آرم بہ وجد

اب یہاں سے اس عالم باعمل، عارف کامل اور غازی و مجاہد

کے حالات اور کارناموں کا آغاز ہوتا ہے جنہیں قدرت نے ان کے نام نامی واسم گرامی "صبغت اللہ" کی مناسبت سے صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغہ کے رنگ میں رنگا تھا اور جنہوں نے حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے احیائے دین کی شمع کو بھی روشن کیا، ورجہاد حریت کے علم کو بھی بلند رکھا۔

مصنف نے ان کا تعارف "تذکرۂ صوفیائے سندھ" کے حوالہ سے سید حمید الدین کے بیان کے حسب ذیل اقتباس سے کرایا ہے:۔

باشندگان سندھ کے نزدیک سارے ملک میں ان جیسا کوئی مرشد وشیخ نہیں۔ تقریباً تین لاکھ بلوچ ان کے مرید ہیں۔ مرجع خلق عام ہیں جاہ وجلال سے زندگی گذار رہے ہیں۔ جود وکرم اور اخلاص ومروّت میں بھی شہرۂ آفاق ہیں۔ ان کا کتب خانہ بڑا عجیب وغریب ہے۔ بادشاہوں اور امرا کے پاس بھی ایسا کتب خانہ نہ ہوگا۔ پندرہ ہزار معتبر کتابیں اس میں موجود ہیں۔

پھر مولانا اعجاز الحق قدوسی کی تصنیف کردہ تذکرۂ صوفیائے سندھ کا مندرجہ ذیل اقتباس ہے:۔

سید صبغت اللہ اول نے جب مسند رشد وہدایت کو زینت بخشی اسوقت سلطنت اسلامیہ کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ پنجاب پر سکھ چھائے ہوئے تھے اور سندھ کے حصول پر انگریزوں اور سکھوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ حالات کی ناسازگاری نے مسلمانوں کو اس درجہ بدحواس، دہشت زدہ اور کم ہمت بنا دیا تھا کہ ان کے قوائے عمل شل ہو چکے تھے۔ سارے معاشرے پر انحطاط کا رنگ غالب تھا۔ مذہب کی روح مفقود ہو چکی تھی۔ اوہام اور رسوم پرستی کو مذہب کا نام دیا جاتا تھا۔ اس تنزل اور انحطاط کے زمانہ میں شاہ صبغت اللہ اول نے اعلائے کلمۃ الحق، تبلیغ واصلاح اور تربیت کا کام شروع کیا۔ اس مرد حق آگاہ نے جب یہ دیکھا کہ سکھ

سندھ کی جانب پھیلنے لگے ہیں تو آپ نے جہاد کا عزم مصمم کرلیا۔ آپ کا کوئی وعظ جہاد کی ترغیب اور فضائل سے خالی نہ ہوتا تھا۔ کچھ اور لاڑ کے مرید جو ان مواعظ میں شریک نہ ہو سکتے تھے آپ نے ان کو خطوط لکھکر جہاد کی اہمیت ان پر واضح کر دی اور انہیں جہاد کے لئے دعوت نامے لکھے۔

اُس دور کے حالات

ان اقتباسات کے بعد مصنف نے سندھ کے سیاسی حالات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، جو حضرت سید صبغت اللہ شاہ کے زمانہ میں برطانوی سامراج نے اپنی روز افزوں ریشہ دوانیوں، سازشوں اور مکاریوں سے پیدا کر رکھے تھے۔

انگریز جس طرح برصغیر میں تاجر کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اسی طرح سندھ میں بھی کلہوڑہ خاندان کے عہد حکومت میں تجارت کا لبادہ اوڑھکر داخل ہوئے۔ کلہوڑوں سے ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ پھر جب سندھ کی حکومت کلہوڑوں سے تالپور خاندان میں منتقل ہوئی تو ۱۸۰۹ء میں میر صاحبان سے بھی معاہدہ کیا اور اسی سال پنجاب میں سکھوں سے بھی معاہدہ کیا۔ ان معاہدوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ سندھ میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتے رہے اور غاصبانہ تسلط کے ارادہ سے اِدھر پچھلے معاہدے توڑتے اور نئے سخت معاہدے کرتے رہے اور اُدھر پنجاب میں سکھوں کو سندھ پر حملہ کرنے کے لئے اُکساتے رہے، مولانا غلام رسول مہر نے اُس وقت کے حالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:-

> سندھ کی مثال سب سے دردناک ہے۔ وہاں کے امیر ایک طرف انگریز سے بدکتے تھے۔ دوسری طرف انہیں سکھوں کی پیشقدمی کا خطرہ تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے کام لیا، وہ سکھوں کی پیشقدمی کے خطرہ کو سب سے بھیانک صورت میں پیش کر کے امیران سندھ پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جماتے رہے۔ رنجیت سنگھ میں اتنی

وسعت قلبی نہ تھی کہ وہ امیران سندھ کو پورا اطمینان دلاکر انگریزی
اثرات کو دور رکھتا اور نہ ہی امیروں میں اتنی ہوشمندری تھی کہ وہ سکھوں
کے خطرہ کی روک تھام کے لئے کسی دوسری تدبیر سے کام لیتے اور انگریزوں
سے بچے رہتے جو تقریبًا ایک سو سال میں بیسیوں دلیسی ریاستوں کو
ہضم کر چکے تھے۔

میر صاحبان میں جذبۂ حریت کی کمی نہ تھی۔ لیکن فوجی قوت کی کمی کی وجہ سے انہیں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ بیک وقت دونوں دشمنوں سے پنجہ آزمائی کرتے اور نہ شاید اسقدر تدبر تھا کہ سیاسی شطرنج بازیوں سے انہیں مات دیکر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے۔ گویا ان کی کیفیت :۔

غریب عشق سامانے ندارد

جنوں دارد ، بیاباتے ندارد

کے مصداق تھی۔ دونوں عیار اور طاقتور دشمن سندھ پر حریصانہ نظریں لگائے بیٹھے تھے اور سندھ ایک بار پھر تاریخ کے کربناک دور سے گذر رہا تھا۔

یہی وہ نازک ترین حالات تھے جن سے حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کا دل تڑپ اٹھا۔ انہوں نے دشمنان دین و وطن کی عیاریوں اور سفاکیوں سے اسلام اور باب الاسلام کو بچانے کے لیئے جہاد کا عزم کیا اور اپنے لاکھوں مریدوں میں تقریر و تحریر کے ذریعہ دین اور وطن کے تحفظ کی تبلیغ شروع کر دی۔ جو مرید حاضر ہوتے ان کو روبرو جہاد کی تلقین کرتے۔ سرفروشی کی ترغیب دیتے۔ آزادی کے فوائد اور غلامی کے مہلک اثرات سے آگاہ فرماتے ، اور جو دور ہوتے ان کو خطوط اور پیغامات کے ذریعہ احکام وہدایات بھیجتے۔ ان کو سجادہ نشینی (۱۸۱۸ء) سے لیکر رحلت (۱۸۳۱ء) تک صرف تیرہ سال کی مہلت ملی جو انہوں نے جہاد کی تیاری اور اس سلسلہ میں مریدوں کی تعلیم وتربیت میں بسر کی۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقینًا پوری طاقت اور تیاری کے ساتھ میدانِ جہاد میں کود پڑتے اور سندھ کی تاریخ کچھ اور ہی طرز پر لکھی جاتی۔

پیر صاحب کی شہرت

اس قسم کے عزائم زیادہ عرصہ تک پوشیدہ نہیں رہ سکتے خصوصاً ان سرفروشوں سے جو خود بھی یہی نصب العین رکھتے ہوں اور حق کی سربلندی کی خاطر باطل سے نبرد آزما ہونے کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہوں. کسی عظیم اور اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر ایسے لوگوں میں ذاتی مسلک اور مشرب کے فاصلے باقی نہیں رہتے. نہ ہی فاصلوں کی دوری ان کو ایک دوسرے سے زیادہ عرصہ تک دور رکھ سکتی ہے اور پھر حاجت مندی تو ایسے فاصلوں کو اور بھی کم کر دیتی ہے۔

حضرت سید صبغت اللہ شاہ بڑے عالم و فاضل تھے اور اہلِ علم و فضل کی بڑی فراخدلی سے سرپرستی کرتے۔ انہیں منقول و معقول پر بڑا عبور حاصل تھا. مختلف علوم وفنون پر اہم ترین اور نایاب قلمی نسخوں پر مشتمل ایک عظیم کتب خانہ قائم کیا تھا. نماز فجر کے بعد قرآن و حدیث کا درس دیتے اور ظہر کے بعد مولانا رومی کی مثنوی کے اسرار و رموز بیان فرماتے۔ ان کی محفل میں بڑے بڑے علما اور صوفیا شریک ہوتے اور ان سے اکتساب فیض کرتے۔ ہندوستانی علما و صوفیا میں سے مولانا اسماعیل، مولانا محمد صالح وزیر آبادی اور مولانا عبدالقدوس سرہندی وغیرہم شریک محفل ہوتے اور ان کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہو کر اپنی علمی اور روحانی تشنگی بجھاتے۔

سید احمد شہید کی آمد

حضرت سید صبغت اللہ شاہ کے غازیانہ اور مجاہدانہ عزائم سے "تحریک مجاہدین" کے قائد سید احمد شہید بریلوی بھی زیادہ عرصہ تک بے خبر نہیں رہ سکے. ان کی آگاہی کی ظاہری وجہ سید صبغت اللہ شاہ کی محفل میں علما و صوفیائے ہند کی آمد و رفت ہی ہو سکتی ہے. تاریخ خاموش ہے لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ ملاقات سے پہلے ان کے درمیان خطوط اور پیغامات کا تبادلہ بھی ہوا ہو. بہرحال یہ تو طے ہے کہ سید صبغت اللہ شاہ کے حالات و کوائف معلوم کر کے سید احمد شہید کے دل میں اُمید پیدا ہوئی اور وہ سکھوں کے خلاف جہاد کے ارادہ سے بالاکوٹ جانے کے لئے ۱۲۴۱ھ میں جب دہلی سے روانہ ہوئے تو تھانیسر، مالیر کوٹلہ، بہاولپور اور راجپوتانہ کے ریگزار سے ہوتے ہوئے

پہلے حیدرآباد سندھ پہنچے جہاں میر صاحبان نے ان کا خیر مقدم کیا اور کچھ نقد رقم اور کچھ ہتھیار ہدیۃً پیش کئے۔ اس کے بعد سید صبغت اللہ شاہ سے آکر ملے اور تقریباً دو ہفتہ تک ان کے یہاں قیام کیا۔ سید صبغت اللہ شاہ نے سید احمد شہید کی بڑی کشادہ دلی سے مہمان داری کی اور ان کے ساتھیوں کو جو جہاد کے لئے سر بکف ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور تمام مجاہدین کے لئے فوجی وردیاں تیار کرا دیں۔ اس اثنا میں دونوں جلیل القدر بزرگواروں نے ایک دوسرے کو پرکھا، سمجھا۔ اپنا اپنا عندیہ ظاہر کیا، باہمی مشورے ہوئے، مستقبل کے لئے منصوبے بنائے گئے اور اخیر دم تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں کئے۔

پیر صاحب کی عسکری امداد

دو ہفتہ کے بعد سید احمد شہید جب پیر گوٹھ سے شکارپور کے لئے روانہ ہوئے تو سید صبغت اللہ شاہ نے اپنے مریدین میں سے جہاد کے لئے پانچ سو غازیوں کی ایک جماعت حرب و ضرب کے ساز و سامان سے لیس کر کے ساتھ کر دی۔ جانی امداد کے علاوہ کثیر مالی امداد بھی دی۔ ان کے اہل و عیال کو پیر گوٹھ میں ٹھہرا کر ان کی کفالت بھی کی اور اپنا بیش قیمت کتب خانہ بھی ہبہ کرنا چاہا۔

حُر کی وجہ تسمیہ

سید صبغت اللہ شاہ کے پانچ سو مریدین کی جو جماعت سید احمد شہید کے ساتھ جہاد کے لئے روانہ ہوئی اسے "جماعت احرار" کا خطاب دیا گیا اور اس کے بعد پاگارہ خاندان کے مریدوں کو ان کی جانبازی اور جاں نثاری کی وجہ سے "حر" کہا جانے لگا۔

جہاد کی تبلیغ

سید احمد شہید سے ملاقات کے بعد سید صبغت اللہ شاہ نے تبلیغ جہاد کو صرف اپنے مریدوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ تمام مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیں اور سید احمد شہید کا ساتھ دیں اور وطن کا تحفظ کریں۔ اس اپیل کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مسلمانوں نے سید صبغت اللہ شاہ کی دعوت پر صدق دل سے لبیک کہا۔ چنانچہ سید احمد شہید کو بعد میں وقتاً

وقتاً غازیوں اور مجاہدوں کی جو کمک بھیجی گئی اس میں سید صبغت اللہ شاہ کے مریدوں (حروں) کے علاوہ دیگر مسلمان بھی شریک ہوتے جن میں علمائے حق کی ایک کثیر تعداد بھی ہوتی تھی۔ یہ کمک محض غازیوں اور مجاہدوں پر مشتمل نہ ہوتی بلکہ اس میں روپیہ، رسد اور سامان حرب بھی ہوتا تھا۔

خط وکتابت

دونوں بزرگواروں کے درمیان اثنائے راہ سے بھی اور میدان کارزار سے بھی خط وکتابت ہوتی رہی۔ سید احمد شہید نے سید صبغت اللہ شاہ کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے بعض دستیاب ہوئے ہیں۔ سید احمد شہید نے اپنے خطوط میں سید صبغت اللہ شاہ کو جن الفاظ والقاب سے مخاطب کیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صبغت اللہ شاہ کا مقام کیا تھا۔ سید احمد شہید ان کو کس قدر عزت وعظمت کی نظر سے دیکھتے تھے اور دونوں بزرگواروں میں کس طرح، محبت اور گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔ سید احمد شہید نے ایک خط میں سید صبغت اللہ شاہ کے لئے یہ القاب استعمال کئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ از امیر المومنین سید احمد، بخدمت
بابرکت سجادہ نشین محافل ارشاد وتلقین راہ نمائے ارباب
صدق ویقین مرجع مستفیدین ملاذ مسترشدین ہادی راہ الٰہ
مخدومی حضرت شاہ صبغت اللہ شاہ مد اللہ ظلال ہدایتہ
علی رؤس العلمین الیٰ یوم الدین۔

سید احمد شہید کے ایک خط سے جو انہوں نے ۴۶-۱۸۴۵ء میں میدان کارزار سے لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پیر کوٹھ میں مقیم تھے تو ان کے اور سید صبغت اللہ شاہ کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ سید صبغت اللہ شاہ خود بھی میدان جہاد میں تشریف لائینگے اور سپہ سالار کی حیثیت سے مجاہدین کے لشکر کی کمان سنبھالیں گے۔ سید احمد شہید اسی تجویز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الحق کہ رغبت بہ سرانجام دادن ایں امر عظیم واختتام ایں مہم

فخیم از امثال آں ہدایت مآب واز مقبولان سرفراز و
ہادیان ممتاز و ارباب ہمت پردازی می زیبد
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مشیّت ایزدی

سید صبغت اللہ شاہ پورے ساز و سامان کے ساتھ میدان جہاد میں جانے کیلئے تیار ہو گئے اور انہوں نے سید احمد شہید کو اپنی آمد کی اطلاع بھی دیدی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور کاتب تقدیر نے جو فیصلے تحریر کئے تھے وہ ان دو بزرگوار مجاہدین کے باہمی فیصلوں سے مختلف تھے سید صبغت اللہ شاہ نے رمضان ۱۲۴۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے پروردگار کے قرب و وصل سے ہمکنار ہوئے اور دو مہینہ بعد ذوالقعد ۱۲۴۶ھ میں سید احمد شہید نے میدان جہاد میں جام شہادت نوش کیا اور اپنا نام ابد تک جریدہ عالم پر ثبت کر گئے۔

سید صبغت اللہ شاہ کی رحلت کے بعد غالباً غازیوں اور سامان حرب کی وہ کمک بند ہو گئی جس کا سلسلہ ان کی زندگی میں جاری رہا اور اس کا اثر جنگ کے نتیجہ پر پڑا۔

غلطی کی اصلاح

اس موقعہ پر ایک اہم تاریخی غلطی کی اصلاح ضروری معلوم ہوتی ہے جس نے ہمارے بیشتر مصنفین و مورخین کو ایک عرصہ سے غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے اور اسکو بار بار دھرایا جا رہا ہے۔ لیکن اعتماد اور یقین کے ساتھ نہیں، بلکہ تذبذب اور انتشار کے ساتھ۔ اسقدر کہ مصنف خود ہی اپنے جال میں پھنسکر تضاد بیانی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قاری بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ اور وہ بھی گومگو کے عالم میں رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سندھ میں حریت پسندی کی داغ بیل سید احمد شہید نے ڈالی تھی اور ان ہی نے سید صبغت اللہ شاہ کو تبلیغ جہاد پر آمادہ کیا تھا۔ لعض مصنفین نے اس معاملہ میں اسقدر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے کہ وہ اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں۔

یہ ایک بھیڑ چال ہے جو ہمارے اکثر مصنفین و مورخین نے اختیار کر رکھی ہے اور بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے کے نقش قدم پر چلے جا رہے ہیں. کسی نے بھی یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ واقعات کو سامنے رکھکر ان کا جائزہ لے اور خود بھی کوئی صحیح نتیجہ اخذ کرے اور اپنے قاری کو بھی گو مگو کی کیفیت سے نجات دلائے. خود اس تذکرہ کے حقیقت پسند اور محقق مصنف بھی متذبذب نظر آتے ہیں اور اسی تذبذب نے ان کی تحریروں میں بھی تضاد کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ صفحہ ۱۱۰ پر رقم طراز ہیں:-

> سرزمین سندھ میں تحریک مجاہدین کا ایک پودا حضرت سید احمد شہید نے بالاکوٹ جاتے ہوئے لگایا تھا جس کی آبیاری حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول المعروف بہ پیر سائیں پاگارو نے کی اور ان کے جاں نثاروں نے اسکی پرداخت اپنی زندگی کا مقصد سمجھکر کی......

باب ششم کی ابتدا میں لکھتے ہیں:-

> سرزمین سندھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے مجاہدین آزادی کے علمبردار حضرت سید احمد شہید اور حضرت سید اسماعیل کے قدم چومے اور ان کے چھوڑے ہوئے اثرات کو تقریبًا ایک صدی تک اس شان سے زندہ و تابندہ رکھا کہ فرنگی حکمرانوں کے ایوان لرز اُٹھے۔ حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول نے حضرت سید احمد شہید کی تحریک آزادی کا جو چراغ سندھ میں روشن کیا تھا اس کی ضو بڑھتے بڑھتے اسقدر پھیلی کہ اس سے برصغیر کی تاریخ کے اوراق جگمگا اُٹھے اور انگریزوں کی آنکھیں چندھیا گئیں.....

اور صفحہ ۱۱۹ پر "سندھ میں حریت پسندی کی تحریک" کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:-

> جس زمانہ میں حضرت سید احمد شہید ہندوستان میں تحریک مجاہدین کی تنظیم کر رہے تھے. ٹھیک اسی زمانہ میں سرزمین سندھ کے جلیل القدر روحانی پیشوا حضرت سید صبغت اللہ شاہ صاحب اول بھی ان ہی

خطوط پر اپنی فکری و نظری تحریک کا آغاز کر رہے تھے ان دونوں
بزرگوں کا نقطۂ نظر ایک ہی تھا. دونوں یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان
سے سکھوں اور انگریزوں کا اقتدار ختم کر کے حکومتِ الٰہیہ کا قیام
عمل میں لایا جائے ......

اسی صفحہ پر" قران السعدین " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :۔

انہیں (سید احمد شہید کو) حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کے افکار
و نظریات کی اطلاع پہلے سے ہی مل چکی تھی اس لئے انہوں نے حضرت
سید سے ملاقات کی خاطر رانی پور کا ارادہ کیا تاکہ وہاں سے پیر گوٹھ
جا سکیں ......

پہلی اور دوسری عبارت میں کہا گیا ہے کہ" سندھ میں تحریک مجاہدین کا پودا
سید احمد شہید نے لگایا تھا جس کی آبیاری سید صبغت اللہ شاہ نے کی" گویا سید احمد شہید
کی آمد سے پہلے سندھ میں حریت کی کوئی تحریک موجود نہ تھی۔

تیسری عبارت میں کہا گیا ہے کہ" جس زمانہ میں سید احمد شہید ہندوستان میں
تحریک مجاہدین کی تنظیم کر رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں سید صبغت اللہ شاہ بھی
ان ہی خطوط پر اپنی فکری و نظری تحریک کا آغاز کر رہے تھے" یعنی دونوں بزرگ
بیک وقت تحریک حریت کی تنظیم میں مصروف تھے۔

چوتھی عبارت میں کہا گیا ہے کہ" سید احمد شہید کو سید صبغت اللہ شاہ کے افکار
و نظریات کی اطلاع پہلے سے ہی مل چکی تھی" یعنی وہ سندھ میں آمد سے پہلے ہی
سید صبغت اللہ شاہ کے عزائم سے آگاہ ہو چکے تھے. اس کا مطلب یہ ہوا کہ سید صبغت اللہ
شاہ سید احمد شہید سے پہلے ہی جد و عمل میں مصروف تھے۔

آخری دو عبارتوں سے پہلی دو عبارتوں کی تردید ہو جاتی ہے اور" تذکرۂ صوفیائے
سندھ" کا اقتباس (صفحہ ۱۱۱ - ۱۱۲) بھی پہلی دو عبارتوں کی تردید کرتا ہے۔

اب اصل حقائق پر غور کرنا چاہیے جن کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے اور

قرائن وقیاس سے بھی۔

سید صبغت اللہ شاہ ۱۸۱۸ء میں سجادہ نشین ہوئے (صفحہ ۱۱۳) اور سید احمد شہید نے ۱۸۲۴ء میں انگریزوں اور سکھوں سے جہاد کے لئے مسلمانوں کو منظم کیا (صفحہ ۱۱۸)

اس سے اگر یہ اندازہ لگایا جائے کہ سید صبغت اللہ شاہ نے سید احمد شہید کی تنظیم سے چھ برس پہلے سجادہ نشین ہوتے ہی جہاد کی تبلیغ اور تیاری شروع کر دی تھی تو بعید از قیاس نہیں ہے۔

چھ برس کے فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ باور کرنا عین قرین قیاس ہے کہ سید صبغت اللہ شاہ نے سندھ میں ۱۸۱۸ء میں تحریک آزادی کا آغاز کیا اور سید احمد شہید نے ۱۸۲۴ء میں ہندوستان میں ان کا اتباع کیا۔

سید صبغت اللہ شاہ سندھ میں رہتے تھے اور سندھ کو دو دشمنوں سے خطرہ درپیش تھا۔ انگریزوں کی طرف سے بھی اور سکھوں کی طرف سے بھی۔

سید احمد شہید جس علاقہ (دہلی اور یوپی) میں رہتے تھے اس کو اور برصغیر کے اکثر علاقوں کو صرف انگریزوں سے خطرہ تھا۔ سکھوں کی ترکتاز دہلی اور یوپی کی طرف نہیں تھی۔ بلکہ ان کی جولانگاہ پنجاب اور صوبہ سرحد تک محدود تھی اور زیادہ سے زیادہ سندھ ان کی حریصانہ نگاہوں کی زد میں تھا۔

بحیثیت مجموعی پورے برصغیر میں حالات ایک ہی جیسے تھے اسلئے دونوں بزرگوں کے دل ودماغ میں ایک ہی جیسے خیالات ابھرے دونوں میں ایک ہی جیسی تڑپ پیدا ہوئی اور دونوں ایک ہی نہج پر سوچنے اور جدوجہد کرنے لگے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سید صبغت اللہ شاہ نے اپنے افکار ونظریات کو جو سجادہ نشینی سے پہلے ان کے دل ودماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ سجادہ نشینی کے بعد (۱۸۱۸ء سے) جامۂ عمل پہنانا شروع کیا اور سید احمد شہید چھ برس بعد (۱۸۲۴ء سے) اس طرف متوجہ ہوئے تھے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو علما وصوفیا سید صبغت اللہ شاہ کی محفلوں میں آکر شریک ہوتے تھے۔ ان کے ذریعے سے سید احمد شہید کو سید صبغت اللہ شاہ کے

۶۰ء ائم ہی کا پتہ نہ چلا ہو گا بلکہ ان کی تبلیغ و تیاری، ان کے جذبۂ خلوص عمل، ان کی ثروت و تمول، ان کی سخا و عطا اور ان کے مریدین (حروں) کی جرأت و مردانگی اور عقیدت مندی وجاں نثاری کا علم بھی ہوا ہو گا۔ اور یہ حالات وکوائف معلوم کرکے انہیں مسرت ہوئی ہو گی کہ ان کے دل میں جو شعلے بھڑک رہے ہیں ان کی تپش کو محسوس کرنے والی شخصیت سندھ میں موجود ہے۔ اور ان کے دل میں امید پیدا ہوئی ہو گی کہ یہ جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخص اتنی مقدرت ضرور رکھتا ہو گا کہ ان کے جذبات کی عملی قدر دانی کرکے ان کی مہم کو آسان بنادے اس لئے وہ دہلی سے صوبہ سرحد جاتے ہوئے راجستھان کا دشوار گذار راستہ طے کرکے سندھ میں محض اس غرض سے آئے کہ سید صبغت اللہ شاہ کے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھیں اور ان سے اپنے درد دل کے مداوا کے طالب ہوں۔ اور حقائق سے ثابت ہو چکا ہے کہ سید احمد شہید نے صحیح سوچا تھا۔ اور سید صبغت اللہ شاہ نے ان کی توقعات سے بڑھ کر ان سے تعاون کیا۔

سید احمد شہید کا جہاد انگریزوں کے خلاف نہیں تھا۔ وہ فقط سکھوں کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور سید صبغت اللہ شاہ انگریزوں اور سکھوں دونوں کے خلاف جہاد کو لازمی ٹھہراتے تھے۔ کیونکہ دین اور وطن کو جو خطرہ سکھوں سے لاحق تھا۔ وہی خطرہ، بلکہ اس سے کہیں زیادہ انگریزوں کی طرف سے بھی تھا

سید احمد شہید کی مدد کرنے سے سید صبغت اللہ شاہ کا ایک مقصد پورا ہوتا تھا۔ یعنی سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا استیصال۔ سکھوں کی طرف سے سندھ کو فوری خطرہ درپیش تھا ان کی حریصانہ نظریں سندھ پر مرکوز تھیں اور سندھ کی حکومت اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ سندھ سید صبغت اللہ شاہ کا وطن تھا اور اپنے وطن کا تحفظ ان کا فرض منصبی تھا۔ لہٰذا انہوں نے سید احمد شہید کے ساتھ بھرپور تعاون کرکے اپنا فرض ادا کیا۔

پیر صاحب کی اعلیٰ ظرفی

اُس دور میں اور آجکل کے دور میں بہت بڑا فرق ہے اُس زمانہ میں سیاست کی اسقدر گرم بازاری نہیں تھی

جسقدر مذہبی عقائد و رجحانات پر توجہ دی جاتی تھی۔ سید احمد شہید اور سید صبغت اللہ شاہ کے عقائد و رجحانات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ سید احمد شہید محمد بن عبدالوہاب نجدی سے متاثر تھے اور سید صبغت اللہ شاہ ایک روحانی پیشوا اور اہل السنّت والجماعت کے رہنما تھے۔ لیکن اصولی طور پر دونوں کا مقصد مشترک تھا۔ دونوں کے پیش نظر دین اور وطن کا تحفظ تھا۔ اسلئے دونوں کا مطمح نظر بھی ایک ہی تھا یعنی جہاد بالسیف۔ لہٰذا سید صبغت اللہ شاہ نے ان اختلافات سے چشم پوشی کر کے ایک بہت بڑے مقصد کیلئے خندہ پیشانی اور فراخدلی سے سید احمد شہید کی حوصلہ افزائی اور اعانت کی جس سے ان کی اولوالعزمی اور عالی ظرفی کا ثبوت ملتا ہے۔

امید ہے کہ ان توضیحات کے بعد اس تاریخی غلطی کی اصلاح ہو جائے گی اور اسے کبھی دہرا کر حقائق پر جذبات کو ترجیح دینے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

حروں کے خلاف جھوٹے الزامات

حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کے ذکر کے بعد مصنف نے پاگارہ خاندان کے مریدوں (حروں) کا ذکر کیا ہے اور ان الزامات کے جواب میں جو حروں پر برطانوی سامراج کے نمک خواروں نے لگائے ہیں، محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے ایک طویل نوٹ کے اقتباسات پیش کئے ہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے لب تاریخ سندھ کے حاشیہ پر لکھکر گویا اس کے مصنف کے منہہ پر طمانچہ مار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب حُروں کے خلاف برطانوی سامراج کے خانہ زادوں کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> سرکار برطانیہ کے اہل کاروں نے یہ الزامات عمداً لگائے ہیں اور ان کی تشہیر میں انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تاکہ مسلمانانِ سندھ عموماً اور اہل سندھ خصوصاً حُروں کی جماعت سے (جو حریت پسند اور سرکار برطانیہ کی دشمن ہے) بدظن ہو جائیں اور انہیں کوئی مدد و معاونت نہ مل سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے نوٹ میں جماعت احرار کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لفظ حُر کی وجہ تسمیہ، اس وقت کے ملکی حالات، سید احمد شہید اور سید صبغت اللہ شاہ کی ملاقات، دونوں مجاہدین کے گہرے تعلقات، سید احمد شہید کی جہاد کے لئے روانگی سید صبغت اللہ شاہ کا مزید اور مسلسل کمک بھیجتے رہنے کے لئے سندھ میں ٹھہر جانا، ان کی خط و کتابت، جہاد اور اس کے نتائج اور ۹۶-۱۸۹۵ء میں عسکری اسپرٹ اور جذبۂ جہاد سے مجبور ہو کر انگریزوں کے خلاف حروں کی عام بغاوت پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور مصنف کی رائے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ نوٹ اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

حروں کا کردار

اس کے بعد مصنف نے حُر جماعت کے کردار کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> یہ جماعت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کے قرآنی حکم پر پوری طرح پابند رہتی آئی ہے۔ وہ اپنے مرشد کو اولی الامر کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اس کے ہر حکم کو جو کہ دین اسلام کے خلاف نہ ہو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ یہ طریقت کا وہ اصول ہے جو اسلامی تصوّف کے ہر سلسلہ کا بنیادی نکتہ تسلیم کیا گیا ہے جسے کسی حالت میں بھی غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس اظہار رائے کے بعد مصنف نے ان کی سیرت و کردار، پابندی شریعت اور اسلامی اقدار کا پاس ملحوظ رکھنے کا حسب ذیل الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:-

> اس جماعت کے لئے صوم و صلوٰۃ کو پابندی کے ساتھ قائم رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسے ساز و سرود کے استعمال سے روکا گیا ہے۔ اس کے افراد رنگین کپڑا نہیں پہن سکتے۔ ان کے لئے ننگے سر چلنا ممنوع ہے۔ ان پر ہر نماز اور خصوصاً عشاء کی نماز کے بعد

ذکر جلی کی پابندی عائد کی گئی ہے۔ انہیں اپنے چہروں کو متشرع رکھنے اور سنّت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور ہمیشہ پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ رہنے کو کہا گیا ہے اس کے علاوہ اس جماعت کو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنے، جھوٹ نہ بولنے، منشیات سے پرہیز کرنے، شرافت، بردباری حق گوئی، نیک نیتی اور اس قسم کی تمام اسلامی اقدار کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔

مسلسل جدوجہد ہندوستان میں سید احمد شہید نے اور سندھ میں سید صبغت اللہ شاہ نے حریت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا وہ ان کے بعد بھی بدستور قائم رہا اور ان کے متبعین اور دیگر حریت پسند مسلمانوں میں نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا رہا۔ ان مجاہد رہنماؤں کی رحلت کے بعد جب انگریزوں کی سازشیں بڑھ گئیں اور انہوں نے مکاری اور فوجی طاقت کے بل پر ہندوستان اور سندھ میں مسلمانوں کی حکومتیں ختم کرکے ان پر اپنا تسلّط قائم کیا تو ان کے متبعین اور دیگر حریت پسند مسلمان خاموش نہیں بیٹھے اور وقتاً فوقتاً انگریز کے خلاف اپنی جان کی بازی لگاتے رہے۔

مصنف نے ان تمام حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے حُروں کی سرگرمیوں۔ گوریلا جنگوں، ۱۸۹۶ء میں بڑے پیمانہ پر جہاد اور تھرپارکر اور سانگھڑ کے علاقوں میں متوازی حکومت کا قیام، انگریزوں کا اپنے مخبروں کے ذریعہ ان کے رازوں سے آگاہ ہونا اور ان کا محاصرہ کرکے ان پر بمباری کرنا اور بعینہٖ وہی ظلم وستم روا رکھنا جو ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے انقلابیوں پر روا رکھے گئے یعنی سولی پر لٹکانا اور گولی مارنا وغیرہ پر پوری پوری روشنی ڈالی ہے۔

حروں پر انگریزوں نے کس قدر مظالم ڈھائے۔ ان کی ایک جھلک قاضی محمد اکبر صاحب اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے بیانات کے ان اقتباسات میں

میں دیکھی جا سکتی ہے جو صفحہ ۱۶۰ - ۱۶۱ - اور ۱۶۲ پر درج ہیں۔

۱۸۳۱ء سے ۱۹۲۱ء تک

حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کے بعد پاگارہ خاندان میں (۱) حضرت سید علی گوہر شاہ اول (۲) حضرت سید حزب اللہ شاہ (۳) حضرت سید علی گوہر شاہ ثانی اور (۴) حضرت سید شاہ مردان شاہ اول مسند نشین ہوئے۔ ان کا دور ۱۸۳۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۱ء تک ختم ہوتا ہے۔ ان عظیم المرتبت اور جلیل القدر پیشواؤں کے تفصیلی حالات اس تذکرہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ مذکورہ بالا واقعات جن کی جانب محض اشاروں اور کنایوں پر اکتفا کیا گیا ہے، ان ہی قابل احترام بزرگواروں کے دور میں پیش آئے۔ اس نوّے سالہ دور کے بعد پاگارہ خاندان کے مجاہدانہ کارناموں اور انگریز کی روایتی عیاریوں اور سفّاکیوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی ۱۹۲۱ء میں بارہ برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے ان کی مسند نشینی کے وقت جو حالات تھے، ان پر اور ان کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد مصنف نے اس بات پر اظہارِ تأسف کیا ہے کہ ان کے ابتدائی حالات پردۂ اخفا میں ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کے ایک مضمون (شائع شدہ ۱۹۵۷ء) کا حسب ذیل اقتباس پیش کیا ہے:۔

> سندھ کے اس مردِ حر کی شخصیت اور کردار پر انگریزی حکومت کے یکطرفہ پروپیگنڈا نے جو پردے چڑھا رکھے ہیں ان کی دبیز تہوں میں سے صرف وطن پرست نگاہیں ہی حقیقت تک پہنچ سکتی ہیں۔ انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے اور شائع ہونے والے اخبار اور رسالے اس "باغی" کے خلاف جو کچھ لکھنا چاہئے تھا، جی کھول کر لکھتے رہے اور اس سلسلے میں

آنے والوں کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ دوسری طرف اس شیر حجری کے ابتدائی حالات ویسے کہیں دستیاب نہیں ہوسکتے جن سے آپ کی شخصیت اور عزائم کا پورا پورا علم ہوتا۔ ہاں آپ کے خاندانی ماحول کے پیش نظر بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فکر و عمل کی ہم آہنگی

آزادی کی تڑپ اور اس کے حصول کے لئے جہاد کا جذبہ آپ کے خون میں شامل تھا۔ سید صبغت اللہ شاہ اول کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری اپنے خون سے کر کے آپ نے اسے ایک تناور درخت بنا دیا۔ اس میں خون اور نسل کا بھی اثر تھا اور ہمنام ہونے کا دخل بھی دونوں صبغت اللہ تھے اور دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر شمع حریت کے پروانے سید صبغت اللہ شاہ اول نے جس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کی تھی۔ سید صبغت اللہ شاہ ثانی نے اسے تکمیل تک پہنچا دینے کی بھرپور کوشش کی۔

انگریز کا مزاج

انگریز جبقدر عیار اور سفاک تھا، اسی قدر دانا اور آزمودہ کار بھی تھا۔ صدیوں کی سیاست اور حکمرانی کے تجربہ نے اس میں مردم شناسی کے ایسے جوہر پیدا کئے تھے جو دوسری قوموں میں کم نظر آئیں گے وہ دوسری قوموں کی بنسبت اپنے دوستوں اور دشمنوں کو پہچاننے میں زیادہ حساس واقع ہوا تھا۔ انگریز کو اپنا اقتدار دنیا کی ہر چیز سے پیارا تھا۔ جو اس کے اقتدار کا حامی تھا وہ اس کا دوست تھا اور جو اس کے اقتدار کو برداشت نہ کرتا وہ اسے دشمن سمجھتا۔ ہر اقتدار پسند کی طرح انگریز جہاں اپنے دوستوں کو فراخدلی سے نوازنے کا مظاہرہ کرتا تھا وہاں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے گر بھی خوب جانتا تھا۔

پیر صاحب کی غیرت

سید صبغت اللہ شاہ ثانی نے سجادہ نشین ہوتے ہی صغیر سنی کے باوجود انگریز کی حکومت کا عطا کردہ آفرین نامہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے جس غیرت و حمیت کا اظہار کیا تھا وہ غیر تحریر شدہ برطانوی آئین کی طرح ان کی انگریز دشمنی کا ایسا دستاویزی ثبوت تھا۔ جس کی اہمیت کو

صرف انگریز ہی سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس "گستاخی" کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی نہ رکھتا تھا اور اسے فراموش کرنے کے وصف سے بھی یکسر محروم تھا۔ ایسے معاملات میں انگریز کی حساسیت کا تصور کرتے ہوئے یہ خیال کرنا بالکل قرین قیاس ہے کہ جب ایوان حکومت میں یہ خبر پہنچی ہو گی تو اس کے در و دیوار ہل گئے ہونگے۔ انگریز نے سید صبغت اللہ شاہ ثانی کے جذبۂ حریت کے اس عملی پہلو کو خطرہ کی گھنٹی سمجھا ہو گا اور یہ خیال کیا ہو گا کہ یہ چھوٹی سی چنگاری اگر آج ہمارے آفرین نامہ کو پرزے پرزے کر سکتی ہے تو کل شعلۂ جوالہ بنکر اس خطہ میں ہمارے اقتدار کی دھجیاں بھی بکھیر سکتی ہے

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

انگریز کا انتقام

سید صبغت اللہ شاہ ثانی کا یہی وہ غیرت مندانہ مظاہرہ تھا جس نے انگریز کو بدحواس کر دیا۔ اس کے اعصاب بری طرح شل ہو گئے اور جوش انتقام میں بچگانہ، بلکہ مجنونانہ حرکتیں کرنے لگا۔ سید صبغت اللہ شاہ انگریز کی آنکھ میں خار بنکر کھٹکنے لگے۔ انگریز نے انکی نشست و برخاست پر کڑی نظر رکھی۔ مخبروں نے لگائی بجھائی کی۔ سازشوں کے جال بچھائے گئے اور مختلف دفعات کے تحت متعدد مقدمات قائم کئے گئے جن میں سے زیادہ تر قتل کے مقدمات تھے اور چند حبس بے جا اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے۔ یہ مقدمات سکھر میں چلائے گئے قائد اعظم محمد علی جناح نے سید صبغت اللہ شاہ کی طرف سے پیروی کی اور تمام الزامات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ خاص طور پر قتل اور حبس بے جا کے ہر الزام سے ان کو بری الذمہ ثابت کر دکھایا۔ لیکن حکومت جو ان کو ہر صورت میں سزا دینے کا تہیہ کر چکی تھی، اس لئے اسلحہ کے الزام میں ان کو دس برس قید کی سزا دی گئی۔

پیر صاحب کا مجاہدانہ کردار

حکومت حروں سے ہمیشہ بدظن اور خائف رہی اور بہانے تراش تراش کر ان پر سختی کرتی رہی

چنانچہ حضرت پیر صاحب کی رہائی میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا کہ حفظ ماتقدم کے طور پر ان کے حوصلے پست کرنے کے لئے ان کے خلاف تشدد کا ایک نیا دور شروع کر دیا۔ سید صبغت اللہ شاہ قید سے رہا ہو کر آئے تو پہلے سے زیادہ پُر عزم اور حوصلہ مند تھے۔ گویا آگ کی بھٹی سے کندن بنکر نکلے تھے۔ انہوں نے آتے ہی از سرِ نو حروں کی تربیت شروع کر دی اور بیک وقت ان کی سیرت و کردار کو سنوارنے اور ان کی عقابی روح کو بیدار کرنے کی طرف توجہ دی۔ حکومت سید صبغت اللہ شاہ کے عزائم سے بے خبر نہ تھی۔ اس نے پہلے تو ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان پر انعام و اکرام کی بارش شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن جب اس بات میں اس کو مایوسی ہوئی اور اس نے یقین کر لیا کہ یہ عنقا اس دام میں پھنسنے والا نہیں ہے تو اپنی پرانی عادت سے مجبور ہو کر پھر تشدد پر اُتر آئی اور اس تشدد کی ابتدا حروں کے خلاف جارحانہ اقدامات سے کی۔ سید صبغت اللہ شاہ نے اتمام حجت کے لئے احتجاج کیا لیکن جب احتجاج کی پرواہ نہیں کی گئی تو ان کے عزائم میں اور پختگی پیدا ہو گئی اور انہوں نے حروں کو حکومت کے سنگدلانہ احکامات کی تعمیل سے روک دیا۔ اس پر حکومت نے ان کو کراچی میں بلوایا اور ان کو بغیر اجازت کے کراچی سے باہر نہ جانے کا حکم سنایا۔ لیکن انہوں نے اس حکم کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کی اور اسی روز کراچی سے سانگھڑ اور سانگھڑ سے پیر گوٹھ روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد ان کو باقاعدہ نظر بند کر کے کراچی میں رکھا گیا۔

انگریز کا پاگل پن

یہ دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا۔ جنگ کی شدت نے انگریز کو پہلے ہی نیم پاگل بنا دیا تھا اور اس پاگل پن میں اس نے جس ظلم و ستم اور وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے سامنے چنگیز و ہلاکو کے ظلم و بربریت کی داستانیں ایک افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اور عالم برزخ میں ان کی روحیں انگریز سے شرمساری محسوس کرتی ہونگی۔

سید صبغت اللہ شاہ کی نظر بندی کے بعد ان کے گڑنگ والے بنگلہ پر بمباری کی گئی۔ اس کے آس پاس کے کچے مکانات کو جلا دیا گیا۔ پیر گوٹھ پر بے تحاشا بمباری کر کے

ان کی حویلیوں کو مسمار کیا گیا اور بارودی سرنگیں بچھا کر ان کے کوٹ (حویلیوں کی فصیل) کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ سانگھڑ میں مارشل لا نافذ کر کے حُروں پر ایسا انسانیت سوز مظالم کئے گئے کہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصہ لینے والے انقلابیوں پر بھی نہیں کئے گئے تھے۔ بلکہ انسانی تاریخ میں آج تک کسی ظالم و جابر نے ایسے ہولناک مظالم نہیں کئے۔ ان مظالم کا سلسلہ اسوقت تک جاری رہا جب تک انگریز کو یہاں سے چلے جانے پر مجبور ہونا نہیں پڑا۔ لیکن خدا جانے یہ حُر کس مٹی سے بنے ہیں کہ ہر ظلم و ستم کو صبر و تحمّل سے برداشت کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں گولیوں کا شکار ہوئے۔ پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالکر سولی پر لٹک گئے۔ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ پولیس اور فوج کے ہاتھوں دن رات شدید ترین اذیتیں سہتے رہے لیکن انگریز کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا تصوّر تک نہیں کیا بلکہ ان کے مجاہدانہ عزائم یعنی انگریز سے نفرت اس سے نبرد آزمائی اور اسکی گرفت سے اِس ملک کی رہائی کے ارادوں میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

غدّاروں کا کردار

ایک طرف حُروں کے خلاف ان لرزہ خیز مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسری طرف حضرت سید صبغت اللہ شاہ کے خلاف پہلے کی طرح خود ساختہ الزامات بغاوت، قتل اور غارت گری وغیرہ کے تحت مقدمات کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ضمیر فروشوں کے ضمیر خریدے جا رہے تھے بلکہ یہ ازلی اور ابدی بدبخت خود ہی بکاؤ مال بنکر اپنے آپ کو انگریزوں کے قدموں میں ڈالنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے۔ گواہوں پر دباؤ اور لالچ کے حربے استعمال کئے جا رہے تھے پہلے سے تیار کردہ بیانات ان کے نام سے رکارڈ کرائے جاتے اور ان سے محض انگوٹھے لگوائے جاتے تھے۔

غدّاروں کو منہ توڑ جواب

نظر بندی کے دوران میں انگریز وقتاً فوقتاً اپنے نمک خواروں کو حضرت سید صبغت اللہ شاہ کی خدمت میں بھیجتا رہا اور انہیں اپنے عزائم سے باز آنے اور معافی مانگ کر پھانسی کے پھندے

سے بچ جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن انگریز اور اس کے خانہ زادوں کو کیا پتہ کہ شہید کربلا کا فرزند ضمیر و اصول کا سودا نہیں کرتا اور اسے اپنی جان سے اپنا نصب العین زیادہ عزیز ہوتا ہے، چنانچہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ انگریز کے تمام ضمیر فروشوں اور زر خرید ایجنٹوں کو ایک ہی جواب دیتے رہے :۔

شہادت ہمارا تاج ہے۔ آگے بڑھکر اسے پہن لینا ہمارے لئے عبادت ہے۔ ہم نے صرف آزادی کو چاہا ہے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ انسان سے معافی مانگنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو صرف اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

پیر صاحب کی شہادت

انگریز نے حروں کے خلاف مظالم، حضرت سید صبغت اللہ شاہ کے خلاف مقدمات، قید و بند کی صعوبتوں اور اپنے عزائم سے باز آنے کی منتوں کے ساتھ ساتھ جھوٹا پروپیگنڈا کرنے، افواہیں پھیلانے، نئے افسانے گھڑنے اور بدنام کرنے کا سلسلہ بھی جاری کیا جو روز بروز بڑھتا گیا۔ لیکن ان حریت پسندوں پر ان باتوں کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے عزائم پر پورے استقلال کے ساتھ جمے رہے۔

انگریز کا جب ہر حربہ ناکام رہا تو اس نے حضرت سید صبغت اللہ شاہ کو سزائے موت سنادی اور ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو علی الصبح انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا ؎

قضا از مشہد ما مشت خونے وام می گیرد ÷ کز و رنگیں کند ہنگامۂ روز قیامت را
بنا کردند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن ÷ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت شہید کا حوصلہ

قید و سلاسل اور دار و رسن کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ان کے خلفا کو ان کے جسد مبارک کی زیارت کرائی گئی۔ لیکن انہوں نے آپ کے چہرہ پر غیر معمولی سکون اور کامل اطمینان کی جھلک دیکھکر آپ کی شہادت کا یقین نہیں کیا اور پھر لاش بھی ان کے سپرد نہیں کی گئی اسلئے انہیں شبہ ہوا کہ آپ کو شہید نہیں کیا گیا۔ بلکہ بے ہوش کر دیا گیا ہے۔

حضرت سید صبغت اللہ شاہ بڑے دلیر، حوصلہ مند اور انتہا درجہ کے متحمل مزاج تھے سزائے موت سننے کے بعد بھی ان کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جیل کے انگریز سپرنٹنڈنٹ۔ جورات کو ان کے ساتھ شطرنج کھیلنے آتا تھا اور مات کھا جاتا۔ اس نے ان کی شہادت سے صرف ایک رات پہلے بھی ان میں وہی صبر و سکون دیکھا، جبکہ ان کو اپنی شہادت کی اطلاع مل چکی تھی اور سپرنٹنڈنٹ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی شطرنج کی بازی میں مات کھا گیا تو ان کی اس غیر معمولی حوصلہ مندی کو دیکھکر حیرت زدہ رہ گیا۔ آپ کے اعصاب و حواس پر سزائے موت کا کوئی اثر نہیں تھا اور آپ بدستور سالم مزاج اور سالم دماغ تھے آپ نے اپنے حریف کی حیرت زدگی دیکھکر فرمایا :-

حق کی راہ میں شہادت حاصل کرنا میرے آباؤ اجداد کی سنت ہے، ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کی خاطر ہنستے کھیلتے پھانسی کے تختہ پر چڑھ جانا ہمارے لئے عین عبادت ہے۔ ہم غلام بننے کے لئے پیدا نہیں ہوئے بلکہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہمارا مقصد حیات ہے۔

یہ کہکر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ جب مقررہ وقت آن پہنچا تو عبادت ختم کر کے خود ہی سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ چلئے وقت ہو گیا ہے۔ تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھ گئے اور جیسا فرمایا تھا ویسا کر دکھایا۔ اقبال نے ایسے ہی مرد مؤمن کے متعلق کہا ہے :-

نشانِ مرد مومن با تو گویم ٭ چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اس شہید حق کی روح پرفتوح پر بے پایاں رحمتیں نازل ہوں۔ اَبد تک اللہ کے قرب و وصل کی نعمتوں سے مالا مال ہوں اور ان کا حشر و نشر اپنے دادا سید الشہدا قتیل کربلا امام عالی مقام سیدنا حضرت حسین علیہ السلام کے ساتھ ہو جن کی حق پرستانہ اور حریت پسندانہ روایت

سر داد نداد دست در دست یزید

کو ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد آپ نے از سر نو زندہ کر دکھایا۔

انگریز کا حشر انگریز نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے حضرت سید صبغت اللہ شاہ اور ان کی جماعت (حروں) کے ہزاروں بے گناہوں کے خون ناحق سے ہاتھ رنگے تھے لیکن قدرت نے سید صبغت اللہ شاہ کے بعد اس کو پانچ برس کی بھی مہلت نہیں دی اور جس سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا اس کے عروج کا سورج چار سال چار مہینے میں غروب ہوگیا۔ نہ صرف اس برصغیر میں بلکہ اس کے تمام ممالک محروسہ میں، اور ایسا غروب ہوا کہ مستقبل میں پہلے کی سی آب و تاب کے ساتھ اس کے دوبارہ چمکنے کا امکان ہی نہیں رہا۔ اور وہ سلطنت جو کبھی کرۂ ارض پر درجۂ اول کی سلطنتوں میں شمار ہوتی تھی اب ایک زوال پذیر سلطنت ہے اور تیسرے درجہ کی سلطنتوں میں شمار ہونے لگی ہے ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

تلک الایام نداولہا بین الناس کا ارشاد الٰہی ہمیشہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ عروج کے بعد زوال اسی طرح اٹل ہے جس طرح زندگی کے بعد موت۔ ظالم کو مہلت ضرور دی جاتی ہے لیکن اسے معاف کبھی نہیں کیا جاتا۔ انگریز نے پچھلی دو صدیوں میں اس برصغیر کے اندر جس درندگی اور غارتگری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مکر و فریب اور جبر و جور سے اپنا تسلط قائم رکھا ہے لاکھوں بے گناہوں کا خون بہایا اور کھربوں اور پدموں کا مال لوٹا ہے۔ اسے برصغیر کی موجودہ اور آئندہ نسلیں بھولنا چاہیں تو بھول جائیں۔ لیکن قدرت اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ بات قدرت کے مزاج کے خلاف ہے کہ وہ اسے بھول جائے۔ انگریز کا زوال شروع ہو چکا ہے اور وہ وقت قریب آرہا ہے جب دنیا دیکھے گی کہ ؎

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

اس تذکرہ کے مصنف نے حضرت شہید اور ان کی جماعت (حروں) کے عزائم اور ان پر انگریز کے مظالم سے متعلق تحریک مجاہدین کے قائد اور جیوش احرار ہند کے سالار اعظم سردار محمد شفیع کی تصنیف "دورِ مستقبل" کا حسب ذیل اقتباس پیش کیا ہے جو کئی لحاظ سے ملاحظہ کے قابل ہے :۔

حضرت شہید کو خراج عقیدت

محترم پیر صاحب پاگارو ملک کے ہیرو تھے۔ وہ وقت آئے گا جب اس بہادر رہنما کا سارے پاکستان میں ہر سال یادگار ڈے منایا جائیگا ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمگیر جنگ میں جب ہندوستان بھر سے قلیل تنخواہ پر کفار کی فوج میں مسلمان خدا کی مخلوق کو مارنے کے لئے انگریز کے ساتھ لپک لپک کر جا رہے تھے اس وقت سندھ کے قابل احترام پیر پاگارو ملک کو آزاد کرانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انہوں نے اسلحہ جمع کر لیا تھا اپنے مریدوں کو مسلح کر کے موزوں وقت کے منتظر تھے کہ ان کے بعض قریبی عزیزوں اور سرکار کے ایجنٹوں نے اس تیاری کا راز انگریز کو بتا دیا اور محترم پیر صاحب کو گرفتار کروا دیا۔ پھر ان کو ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا اور ایک مقدمہ کا ڈھونگ رچا کر آپ کو پھانسی دیدی گئی۔ پنجاب میں صرف مجلس احرار نے خون کے آنسو بہائے۔ ایک ریزلیوشن پیر صاحب کی حمایت میں اور انگریزوں کے ان مظالم کے خلاف پاس کر کے ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ جس پر ان کے تین سو کارکن گرفتار کر لئے گئے اور ان کو ایک ایک سال کی سزا دیکر جیلوں میں بھیجا گیا۔ انگریز نے سندھ میں مارشل لا لگا کر حروں کو جنگلوں میں گھیر گھیر کر گولیوں کا نشانہ بنایا۔ ان کے لئے اسپیشل جیل بنے اور کئی سال تک ان پر تشدد ہوتا رہا۔ اب وقت آگیا ہے کہ کوئی صاحب قلم اور اہل دل ان بہادروں کی مکمل اور مفصل تاریخ لکھکر آنے والی نسلوں کو ان سے روشناس

کرانے کا بندوبست کرے۔ ایسا بہادر رہنما اور ایسے بہادر لوگ تاریکی میں
گم نہیں کیے جا سکتے۔

اسی سلسلے میں مصنف نے قاضی محمد اکبر صاحب کے ایک بیان کا اقتباس پیش کیا ہے جو بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے:-

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے پیر صاحب (شہیدِ حق حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی) کو اپنی چشم گنہ گار سے دیکھا ہے۔ یہ انسانی حُسن کا نادر نمونہ تھے اور روحانی عظمت نے ان کے چہرہ پر بلا کا نور اور جلال بکھیر دیا تھا کہ کوئی شخص خواہ وہ کس قدر بھی مضبوط دل رکھتا ہو۔ ان سے آنکھ ملانے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ بڑے بڑے انگریز، سَر اور خان بہادر اس مجاہد اعظم کے سامنے جاتے تو ایکبارگی لرز جاتے تھے۔ لیکن یہ کس قدر شرمناک حقیقت ہے کہ اس عظیم انقلابی مجاہد کے خلاف جھوٹا مقدمہ گھڑنے والے اور شہادتیں دینے والے بیگانے نہ تھے، خود اپنے ہی تھے۔ اس طرح ان کی غداری کی روایت یہاں بھی قائم رہی۔ بہرحال انگریز حُر جماعت کو کچل نہ سکا اور نہ اس کا شیرازہ منتشر کر سکا۔

حضرت شہید کے ذاتی اوصاف

مصنف نے ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے ایک مضمون کے حوالہ سے صفحہ ۱۹۰ پر حضرت شہید کی ذاتی زندگی کی چند جھلکیاں پیش کی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح دیندار اور نیکوکار تو تھے ہی۔ لیکن سچے عاشق رسول بھی تھے متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ نرم خو اور رحمدل تھے۔ اپنے مریدوں کے ساتھ مل کر معمولی کام کرنے میں بھی عار محسوس نہ کرتے اور ان میں جو مسکین اور ضعیف ہوتے ان کی دلجوئی کر کے خوش ہوتے۔ لیکن حکومت کے اہل کاروں کی ویسی عزت نہ کرتے جیسی دوسرے لوگ کرتے تھے۔ ایک بار ایک ڈپٹی کلکٹر کے پوچھنے پر فرمایا تھا کہ:-

ان لوگوں کی عادات واطوار دیکھکر جب کبھی میں یہ ارادہ بھی کرتا ہوں کہ ان کی عزت کروں تو مجھے اپنے حسینی ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔

حضرت شہید کے حالات وکوائف دیکھکر دل گواہی دیتا ہے کہ اقبال نے اس شعر میں ان کی جھلک پیش کی ہے ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

حضرت شہید کی زندگی کے متعلق ہفت روزہ "لیل ونہار" کے ایک مضمون کا اقتباس بھی قابل ملاحظ ہے جو مصنف نے صفحہ ۱۹۴ سے صفحہ ۱۹۷ پر درج کیا ہے۔

حضرت شہید کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے بعد انگریز کے انتقام کی آگ کو بجھ جانا چاہیے تھا لیکن یہ آگ بجھی نہیں بلکہ اور بھڑک اٹھی ؎

ہم نے سمجھا تھا کہ ہے عشق یہیں تک محدود
منزلیں اور بھی آئیں رسن و دار کے بعد

دار و رسن کے بعد

انگریز نے حضرت شہید کے صغیر سن صاحبزادگان حضرت سید سکندر شاہ (موجودہ پیر پاگارو) اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت سید نادر شاہ کو اپنے مطلب کی تعلیم وتربیت دلانے کے لئے انگلینڈ بھیجا۔ پھر ان کی مسند کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہا لیکن حُر موجود تھے جو انگریز کے بے انتہا مظالم کے بعد بھی کچلے نہیں جا سکے تھے۔ اس لئے مسند کو ختم کرنے کے بجائے اس پر کسی ایسے غدار اور اپنے آلۂ کار کو بٹھانے کا ارادہ کیا جو اس کا کاسہ لیس ہو اور اس کے بوٹ کی ٹو چاٹنے میں فخر محسوس کرتا ہو۔ لیکن حروں نے یک رائے اور یک آواز ہو کر اس شرمناک سازش کی مخالفت کی اور صاف صاف کہدیا کہ "اس مسند پر حضرت شہید کے جائز وارث حضرت سید سکندر شاہ کے سوا کسی اور کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیجا سکتی"

حروں کے یہ تیور دیکھکر انگریز چڑ گیا اور اس نے مسند کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا

اور کاسہ لیس غدار کو جسے اپنی "خدمات" اور حضرت شہید کے خلاف سازشیں کرنے کے صلہ میں پاگارہ خاندان کی مسند بخشد ینا چاہتا تھا۔

دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

کے مصداق زرعی زمین کا ایک ٹکڑا بخشدیا۔

حضرت شہید کو تختۂ دار پر لٹکانے کے بعد انگریز نے پاگارہ خاندان اور اسکی جماعت (حروں) کے خلاف جو بھی اقدام کیا اس میں بری طرح ناکام ہوا۔ پیر گوٹھ میں کوٹ پر بمباری کر کے اسے ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ پہلے سے بھی زیادہ آباد اور بارونق ہے۔ مسند کو ختم کر دیا تھا، مگر وہ بدستور قائم ہے۔ حروں کو کچل کر نیست و نابود کرنا چاہا تھا لیکن وہ زندہ و پائندہ اور صحیح و سلامت ہیں حضرت شہید کے صاحبزادگان کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے اور ان کے دل و دماغ سے خاندانی اثرات کو زائل کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کے بہانے انگلینڈ میں زیرحراست رکھا تھا۔ مگر وہ سچے مسلمان اور دولتِ ایمان سے مالا مال ہیں اور ان کا اخلاق و کردار اسلامی اقدار و شعائر کی پابندی کے اعتبار سے ان کے اسلاف کی روحوں کے لئے باعثِ اطمینان ہے۔

لیمبرک کے الزامات کا جائزہ

دل زدستم بردآں شوخے کہ از طفلی ہنوز
لذتِ مضمون دل بردن نمی داند کہ چیست

"دہشت پسند" (THE TERRORIST) کے مصنف مسٹر ایچ۔ ٹی لیمبرک نے شہید حق حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی پر الزام لگایا ہے کہ وہ "دہشت پسند اور کانگریس کے آلہ کار تھے"۔

جھوٹ بولنے، جھوٹ کو نبھانے اور اس پر سچ کا پردہ ڈالکر اپنے مخاطب کو باور کرانے کے لئے جس غیر معمولی عقل و فہم یا عیاری و مکاری کی ضرورت ہوتی ہے اس سے لیمبرک محروم معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک معمولی عقل وادراک اور فہم و فراست رکھنے والا شخص ہے۔ جسے جھوٹ بولنے کے باوجود جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ حضرت شہید اور ان

کی جماعت (حروں) کے خلاف "دہشت پسند" تصنیف کرنے کیلئے جس نے بھی اس سے فرمائش کی ہے۔ اس نے ایک نااہل اور ناموزوں شخص کا انتخاب کیا ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ہمیشہ عدم تشدد پر کاربند رہی ہے اور حضرت شہید اور ان کی جماعت (حر) جہاں تک برصغیر سے برطانوی استعمار کی بیخ کنی کا تعلق تھا عدم تشدد کے قائل نہیں تھے۔ اس صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ دونوں میں اشتراک عمل ہوتا۔ اور اگر یہ ممکن تھا تو پھر حضرت شہید اور ان کی جماعت (حر) دہشت پسند کیسے ہو سکتے تھے؟!

اگر حضرت شہید کا کانگریس سے کوئی تعلق ہوتا تو سندھ پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر چوئتھرام کی سرکردگی میں سندھ اسمبلی کانگریس پارٹی کے چند ممبران کا وفد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کانگریس میں شمولیت کی دعوت کیوں دیتا اور پھر حضرت شہید وفد کو یہ جواب کیسے دیتے کہ:-

> ہم کسی کی سیادت اور قیادت قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کیونکہ ہمارے رہنما ہادی برحق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہمارا دستور العمل قرآن ہے۔

تقریباً اسی قسم کا جواب مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دینے والے مسلم لیگی وفد کو بھی دیا تھا اور فرمایا تھا کہ:-

> ہمارے طریقۂ کار اور مسلم لیگ کے نظریات میں بہت فرق ہے اس لئے ہم اس میں شمولیت کرنے سے معذور ہیں۔

حضرت شہید اگر کانگریس سے وابستہ ہوتے یا ڈاکٹر چوئتھرام کی دعوت کے بعد وابستہ ہو جاتے تو انہیں گاندھی جی کی قیادت اور ان کے نظریۂ عدم تشدد کو قبول کرنا پڑتا جو ظاہر ہے کہ حضرت شہید جیسی بلند و بالا شخصیت اور شمشیر و سناں سے کھیلنے والے غازی و مجاہد کے لئے ناممکن تھا۔

عدم تشدد، ہڑتالیں اور اسی قسم کی دوسری باتیں سیاسی شعبدے ہیں، اور

حضرت ان سیاسی شعبدہ بازیوں میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے وہ " اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا " پر اعتقاد رکھتے تھے اور " اینٹ کا جواب پتھر " کے قائل تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شہید اور کانگریس کے نصب العین میں ہم آہنگی تھی۔ واقعی ہم آہنگی تھی لیکن اس طرح، جس طرح دنیا کے ہر خطہ کے علمبرداران آزادی میں ہوتی ہے۔ مگر دونوں کے طریقۂ کار میں چونکہ اختلاف تھا اس لئے ان کا باہمی اشتراک و تعاون محال تھا۔

الزامات عائد کرنے کے سلسلہ میں لیمبرک کے پاس چونکہ حقائق، معقولیت اور استدلال کا افلاس ہے اسلئے بازاری لوگوں کی طرح

اذا یئس الانسان طال لسانہ

کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت شہید کی ذات گرامی کے متعلق رکیک حملے کرنے پر اُتر آیا ہے۔ حالانکہ وہ جیل میں حضرت شہید کے ساتھ رہا ہے اور خود اس بات کا عینی گواہ ہے کہ حضرت شہید شب زندہ دار اور عبادت گزار بھی تھے اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ایک مثالی انسان بھی۔ اس کے علاوہ جس شخص کے دل میں آزادی کی تڑپ اور جہاد کا جذبہ ہو وہ اپنے مقصد سے مُنہ موڑ کر انسانی خواہشات کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہے۔ مختلف ملکوں کے رہنمایان قوم کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے سب کچھ میسّر ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ترک کر دیا اور اپنی تمام تر توجہ اپنے مقصد کی تکمیل کی طرف منعطف کر دی۔

مسٹر لیمبرک کہتے ہیں :-

حُر دہشت پسند، قاتل اور ڈاکو تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر قاتل اور ڈاکو دہشت پسند ہوتا ہے لیکن کیا قاتل اور ڈاکو سپاہی بھی ہوتے ہیں؟ تاریخ بتاتی ہے کہ آج تک کوئی قاتل اور ڈاکو سپاہی نہیں بنا۔ کبھی میدان کارزار کا رخ نہیں کیا۔ کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے جان کی بازی نہیں لگائی۔ ڈاکے ڈالنے کے لئے دہشت بھی پھیلاتے ہیں اور قتل بھی کرتے ہیں لیکن ان کی

غرض چونکہ سفلی ہوتی ہے۔ اس لئے طبعًا بزدل ہوتے ہیں۔ ان سے سپاہی بننے اور جانبازی کرنے کی توقع نہیں جاسکتی۔ اس کے برعکس حُر سپاہی ہیں۔ ان کے سامنے ہمیشہ اعلیٰ مقصد رہا ہے۔ یعنی دین اور وطن کا تحفظ، اور وہ اس مقصد کے لئے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک برطانوی سامراج کے خلاف لڑتے رہے ہیں اور سامراج کے بعد بھارتی رام راج سے بھی لڑے ہیں۔ لیمبرک نے خود اعتراف کیا ہے کہ :۔

(۱) حُر مجاہدین نے ۱۹۶۵ء کی پاک۔ بھارت جنگ میں سانگھڑ، تھرپارکر، خیرپور اور رحیم یارخان وغیرہ اضلاع کی سرحدوں میں وہ کارنامے انجام دیئے تھے کہ ہندو آرمی کے بڑے بڑے کمانڈر بوکھلا اٹھے تھے۔

(۲) ۱۹۷۱ء میں حُر مجاہدین سے خاطرخواہ کام نہ لینے کی وجہ سے ان سرحدوں پر پاک آرمی کو نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

یہ کس کے کردار کا خاکہ ہے، غازیوں اور مجاہدوں کے کردار کا یا قاتلوں اور ڈاکوؤں کے کردار کا ؟ لیمبرک کو اپنے گریبان میں منہ ڈالکر سوچنا چاہئے کہ آخر یہ کیسا کرشمہ ہے کہ وہ اتنی بہتان طرازیوں کے باوجود بے اختیار کلمۂ حق کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ؟ کیا یہ حروں کی حق پرستی اور راستبازی کی دلیل نہیں ہے ؟

مسٹر لیمبرک لکھتے ہیں :۔

وہ (حضرت شہید اور حُر) برطانوی سلطنت کے غدار تھے۔

ایک عرب شاعر نے کہا ہے :۔

ومليحه شهدت لهاضرآتها ❊ والفضل ماشهدت به الاعداءُ

(حسین عورت وہ ہے جس کی سوکنیں بھی اس کے حسن کا اقرار کریں اور (اصل میں) خوبی وہی ہے جسکی دشمن گواہی دیں)

یہی وہ الفاظ ہیں جنہیں لیمبرک جیسے شخص کی زبان سے سننے کے لئے حضرت شہید اور حُروں کے پرستار مدتوں سے منتظر تھے، اور یہی وہ حق بات ہے جو کبھی کبھی اضطرار کے عالم میں دشمن کے منہ سے بھی نکل جاتی ہے۔

کیا لیمبرک نے حضرت شہید اور حروں کو "برطانوی سلطنت کا غدار" لکھتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ان کو "حریت پسند" اور "محبِ وطن" ہونے کا سرٹیفکیٹ دے رہا ہے؟

حضرت شہید واقعی ایک عظیم حریت پسند اور محبِ وطن تھے جو زندگی کے آخری لمحہ تک برطانوی سامراج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اسی طرح حروں کی حریت پسندی اور حب الوطنی کا زندہ و پائندہ ثبوت یہ ہے کہ سوا سو سال تک برطانیہ جیسی منظم اور مسلح حکومت سے نبرد آزمائی کرتے اور جان و مال کی قربانیاں دیتے رہے لیکن اپنے نصب العین سے ذرہ بھر بھی پیچھے نہیں ہٹے۔

مسٹر لیمبرک نے لکھا ہے کہ :-

انگریز نے حروں کو کچل کر ہندوستان پر بڑا احسان کیا ہے۔

انگریز نے حروں کو کچل کر متحدہ ہندوستان میں اپنے استعمار کی عمر دراز کرنی چاہی تھی یہ ہندوستان پر احسان نہیں، بلکہ اس کے ساتھ عداوت تھی۔ لیکن قدرت نے انگریزی استعمار کی عمر کوتاہ کر دی۔ حُر بھی زندہ ہیں اور ہندوستان بھی آزاد ہو چکا ہے لیکن انگریز اور اس کے استعمار کو جنگ عظیم نے کچل کر رکھ دیا۔ سیاسی اعتبار سے بھی اور اقتصادی اعتبار سے بھی اب وہ ماضی کو یاد کر کے خون کے آنسو رو رہا ہے اور کوئی نہیں ہے جو اس کے آنسو پونچھے۔

انگریز نے حضرت شہید کی زندگی میں ان کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا تھا اور ان پر جو عجیب و غریب الزامات لگائے تھے۔ ان میں سے ایک الزام یہ بھی تھا کہ "وہ سندھ کے بادشاہ بننا چاہتے ہیں" لیکن میجر اٹیلی (برصغیر کی تقسیم کے وقت برطانیہ کے وزیر اعظم) نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں سائیں رکھیو نامی ایک حُر مجاہد کا جو "آخری پیغام" پڑھ کر سنایا تھا۔ اس سے اس الزام کی تردید ہوتی ہے۔ سائیں رکھیو کا پیغام یہ ہے :-

> دوستو، میری اس جانگداز جدوجہد کا نتیجہ آخر کار ہمارے حضرت پیر سائیں کی فتح و کامرانی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ انگریز جلد ہی اپنا بوریا بستر باندھ کر ہندوستان سے رخصت ہو جائے گا۔ اور نظامِ حکومت بالآخر ہمارے ہی ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں آ کر رہیگا

اس پیغام میں " نظام حکومت ہمارے ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں آئے گا " کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ نہیں ہیں کہ " نظام حکومت ہمارے حضرت پیر سائیں کے ہاتھ میں آئے گا "۔ یہ پیغام لیمبرک نے بھی اپنی کتاب " دہشت پسند " میں نقل کیا ہے۔ اس پیغام سے ثابت ہوتا ہے کہ :-

(۱) حضرت شہید کے خلاف انگریز کا پروپیگنڈا غلط تھا۔

(۲) اور حضرت شہید کی جدوجہد کسی شخصی غرض پر نہیں، بلکہ حریت پسندی اور حب الوطنی کے جذبہ پر مبنی تھی۔

بفرض محال اگر یہ پروپیگنڈا درست بھی ہو تو یہ کیسی منطق ہے کہ ایک اجنبی قوم سات سمندر پار سے آ کر اس ملک پر تسلّط کرلے تو جائز، اور اگر اس ملک کا کوئی باشندہ اپنے ملک پر حکومت کرنے کی خواہش کرے تو ناجائز ؟ !

موجودہ پیر پاگارو

موجودہ پیر پاگارو حضرت سید سکندر شاہ الملقب بہ شاہ مردان شاہ ثانی، شہید حق حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی کے خلف اکبر اور جانشین ہیں۔ فروری ۱۹۵۲ء سے اپنے آباؤ اجداد کی مسند پر جلوہ افروز ہوکر لاکھوں مریدوں (حروں) کی روحانی رہبری کر رہے ہیں۔ آپ نے انگریزی کی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی اور انگلینڈ میں حاصل کی ہے اور عربی و فارسی میں دینی علوم کی تعلیم پاکستان میں۔ آپ ایک دیندار اور نیکوکار مسلمان ہیں اور سیرت و کردار کے اعتبار سے ایک عظیم انسان۔ آپ ساتویں پاگارہ ہیں۔ آپ سے پہلے اس خاندان میں چھ پاگارے گذرے ہیں۔ آپ جس خاندان کے چشم و چراغ ہیں وہ مسلسل دوسو سال سے یعنی حضرت سید محمد بقا شہید سے لیکر موجودہ پیر پاگارو حضرت سید شاہ مردان شاہ ثانی تک تبلیغ اسلام، احیائے دین، رشد و ہدایت اور تحفظ وطن کے لئے جہاد و جانبازی اور ایثار و قربانی کے فرائض انجام دیتا رہا ہے۔ وطن کی آزادی اور اس کی سرحدوں کا تحفظ کرنے کے سلسلے میں جو قربانیاں آپ نے اور آپ کے خاندان نے پیش کی ہیں۔ ان کی مثال اس برصغیر کے اندر کسی دوسرے خاندان میں نہیں ملتی۔

آپ کے حالات اس تذکرہ کے مصنف نے جس عرق ریزی، تحقیق اور باریک نظری سے قلمبند کیے ہیں، وہ ملاحظہ کے قابل ہیں اور ان سے اچھی خاصی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں روزنامہ "جسارت" نے اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اور ہفت روزہ "لیل و نہار" نے مئی ۱۹۷۳ء میں خود آپ سے جو انٹرویو لئے ہیں وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں آپ نے اپنے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بعض ایسے اسرار سربستہ کو بے نقاب کیا ہے جو معلوم تو اکثر لوگوں کو تھے اور بعض حضرات نے اشاروں کنایوں میں ان کا ذکر بھی کیا ہے مگر کسی نے ان پر سے اسطرح سے پردہ نہیں اٹھایا تھا جس طرح آپ نے اٹھایا ہے۔ یہ دونوں انٹرویو اس تذکرہ کے صفحہ ۲۳۳ سے صفحہ ۲۴۳ پر درج ہیں۔

دینی اور علمی خدمات

آپ کے حالات وکوائف پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مسند نشیں ہوتے ہی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا اور اپنی تمامتر توجہ تعمیر و اصلاح کی جانب مبذول کر دی احیاء دین کے لئے آپ نے وسیع پیمانہ پر دینی اور شرعی علوم کی تعلیم و ترویج کو بہت ضروری سمجھا اور اس کے لئے آپ نے سب سے پہلے پیر گوٹھ میں جامعہ راشدیہ کو از سر نو زندہ کیا۔ یہ دینی درسگاہ حضرت سید شاہ مردان شاہ اول نے قائم کی تھی۔ لیکن جب "مہذب اور با اخلاق" انگریز نے کوٹ پر بمباری کی تو یہ درسگاہ اور اس سے ملحق لائبریری بھی اس کی "تہذیب و شرافت" کی نذر ہو گئی اور اس کی نادر و نایاب غیر مطبوعہ کتابیں کچھ تو لنڈن کی انڈیا آفس لائبریری میں پہنچا دی گئیں اور کچھ ایسے لیٹروں نے اڑا لیں جنھیں تذکرہ کے مصنف نے "مار آستین" کے موزوں ترین خطاب سے نوازا ہے۔ حضرت شاہ مردان شاہ ثانی نے جامعہ کے پرانے کھنڈرات پر ایک نئی عمارت تعمیر کروائی جو پہلی عمارت سے چار پانچ گنا بڑی ہے۔ اس میں نو کمرے کلاس روم کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، بارہ کمرے طلبا اور آٹھ کمرے اساتذہ کی رہائش کے لئے۔ لیکچر ہال اور لائبریری ہال اس کے علاوہ ہیں۔ طلباء اور اساتذہ کی رہائش، خوراک، کتابیں، کپڑے اور علاج و معالجہ کی سہولتیں جامعہ کی طرف سے مہیا کی جاتی ہیں جن کے تمام اخراجات حضرت شاہ مردان

شاہ ثانی ادا فرماتے ہیں ۔ اس جامعہ میں ہمیشہ بڑے بڑے ثقہ اور جیّد علما وفضلا اور مانے ہوئے ماہرین تعلیم درس دینے پر مامور رہے ہیں اور اب تک دو سو علما جامعہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کی تربیت پر یعنی ان کی سیرت و کردار کی تہذیب و اصلاح پر خاص توجہ دی جاتی ہے ۔

جامعہ کی لائبریری میں پچاس غیر مطبوعہ نسخے اور ساڑھے تین ہزار مطبوعہ کتابیں موجود ہیں جو تفسیر، حدیث، فقہ اور امور دین سے متعلق مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہیں یہ کتابیں حضرت شاہ مردان شاہ ثانی نے مہیا فرمائی ہیں اور ابھی لائبریری کی توسیع کے لئے کوششیں جاری ہیں ۔

جامعہ کی تعلیم کا معیار بہت اعلیٰ ہے اور مقررہ معیار پر پورے اترنے والے طلبا ہی کو سندات دی جاتی ہیں ۔ فارغ التحصیل طلبا کو سندات حضرت پیر سائیں خود عطا فرماتے ہیں اور سندات عطا فرماتے ہوئے ان کو جوش و جذبہ اور خلوص سے کام کرنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے اور للّٰہیت اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ انہیں ایسی تمام باتوں سے منع کرتے ہیں جو علم و فضل اور جامعہ راشدیہ کے وقار کے منافی ہوں ۔ نیز ان کو تفرقہ بازی سے پرہیز اور حق و صداقت کی تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں ۔

جامعہ راشدیہ کے سند یافتہ علماء سندھ کے تمام اضلاع میں موجود ہیں اور مدرس خطیب اور واعظ کی حیثیت سے احیائے دین اور اشاعت علم کی خدمات انجام دے رہے ہیں

جامعہ راشدیہ کی شاخیں سندھ کے مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی ہیں ۔ ضلع سانگھڑ جو حروں کا مرکزی مقام ہے اسمیں چھ شاخیں ہیں ۔ بعض مدرسوں کے ساتھ لائبریریاں بھی ملحق ہیں ۔ اکثر مدرسوں کے سرپرست خود حضرت پیر سائیں ہیں اور ان کے تمام اخراجات کے کفیل بھی وہ خود ہی ہیں ۔ ان مدرسوں کے اکثر اساتذہ پاک ۔ بھارت جنگوں میں بھی شریک رہے ہیں ۔

اپنی حکومت سے تعاون

انگریز کے دور میں حروں کے خلاف جو قیامت صغریٰ قائم تھی اور مختلف دفعات

کے تحت چھوٹے مقدمات قائم کرکے ان کو پھانسی، عمر قید اور دیگر سخت سزائیں دی جارہی تھیں۔ اس لئے بعض حُر روپوش ہوگئے تھے۔ حضرت پیر سائیں نے ایسے تمام حروں کے نام ہدایات جاری کردیں کہ منظرِ عام پر آئیں اور خود کو قانون کے سپرد کردیں کیوں کہ اب انگریز کی نہیں بلکہ اپنے ملکی لوگوں اور مسلمان بھائیوں کی حکومت تھی اور اس سے چھپنے یا پنجہ آزمائی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمام روپوش حُر حضرت پیر سائیں کی خدمت اقدس میں حاضر ہوگئے اور انہوں نے ان کو حکومت کے حوالے کردیا۔ مقدمات چلے اور اکثر باعزت بری ہوگئے۔

بُدامنی کی روک تھام

۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیان ڈاکوؤں کے دو گروہ پیدا ہوئے جنہوں نے ڈاکے ڈالکر اور پُرامن شہریوں سے چٹھیوں کے ذریعہ رقمیں منگوا کر ایسی دہشت پھیلائی کہ لوگوں کی زندگی زہر ہوگئی۔ پولیس ان کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی۔ ایک بار فوج بلائی گئی مگر وہ بھی ناکام رہی۔ آخر کار انتظامیہ اور عوام نے حضرت پیر سائیں سے مدد کرنے کی استدعا کی۔ آپ نے حُروں کو حکم دیا کہ ڈاکوؤں کے استیصال میں انتظامیہ سے تعاون کریں۔ حروں نے حکم ملتے ہی ڈاکوؤں کا تعاقب کیا اور سیہون کے ایک جنگل میں جاکر ان کو گھیر لیا۔ طرفین میں تین گھنٹے تک فائرنگ ہوئی اور تمام ڈاکو حروں کی گولیوں کا نشانہ بنگئے

اسی طرح ۱۹۶۹ء میں بھی حروں نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا تعاقب کیا جو میدانی علاقہ سے بھاگ کر ضلع دادو کے "بھگو ٹوڑھو" پہاڑ میں جاکر مورچہ بند ہوگیا حروں اور ڈاکوؤں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ گروہ کے سرغنہ کا بھائی مارا گیا۔ باقی ڈاکو بلوچستان کی طرف بھاگ گئے۔

امن پسندی

لسانی فسادات کے دوران سندھ کے دوسرے حصوں میں کافی جانی اور مالی نقصان ہوا۔ لیکن جہاں حروں کی اکثریت تھی وہاں فساد کی ایک واردات بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ حضرت پیر سائیں نے حروں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ فسادات نہ ہونے دیں۔ اس لیے حروں نے حضرت پیر سائیں کی ہدایت

کی تعمیل کرتے ہوئے فسادات کو روکنے کی کامیاب کوشش کی اور راتوں کو پہرہ دیکر لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی۔

پیر صاحب کی جنگی خدمات

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ

(اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے جنت کے عوض ان کی جان و مال کا سودا کر لیا ہے)

حُر، اس لئے حر ہیں کہ وہ حریت پسند ہیں۔ حریت ان کی رگ رگ میں اور خون کے قطرہ قطرہ میں سمائی ہوئی ہے۔ ان کے پیرانِ طریقت نے ان کو تعلیم ہی ایسی دی ہے کہ وہ حریت کو زندگی سمجھتے ہیں اور غلامی کو موت، وہ سمجھتے ہیں کہ حریت ایمان کی علامت ہے اور غلامی کفر کی علامت، ان کی حریت پسندی کی اصل حقیقت معلوم کرنا ہو تو انگریز سے معلوم کی جائے جو زبان سے تو دہشت پسند کہتا ہے لیکن دل میں ان کی حریت پسندی کا معترف ہے۔

انگریز کے چلے جانے پر اٹھارہ برس کے عرصہ میں حروں کو اپنے مجاہدانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان کے ایمان سے لبریز دلوں میں کفر سے معرکہ آرائی کے جذبے اٹھتے ہونگے اور ان کی حق پرست روحیں باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے تڑپتی ہونگی وہ اُٹھتے بیٹھتے میدان کارزار کا تصور کرتے ہونگے اور سوتے جاگتے جہاد کے خواب دیکھتے ہونگے کہ اچانک ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ۷ ستمبر کو حضرت پیر سائیں پاگارہ شاہ مردان شاہ ثانی نے حروں کو مجاہد فورس میں بھرتی ہونے کی ہدایت کی اور عمر کوٹ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو آپ خود عمر کوٹ تشریف لیگئے جہاں بیس ہزار حُر مجاہدین کا اجتماع تھا اور "بھیج پاگارہ" کے بھارت شکن نعروں سے عمر کوٹ کی فضا کو گرما رہا تھا۔

بھیج پاگارا

"بھیج پاگارہ" حُر مجاہدین کا محبوب ترین نعرہ ہے۔ یہ نعرہ بلند کر کے وہ اپنے پیر طریقت سے اپنی بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نعرہ سے ان کے دل میں مردانگی اور شجاعت کے ولولے بیدار

ہوتے ہیں۔ ان کی روح تڑپ اٹھتی ہے۔ ان پر جذب اور سرمستی طاری ہو جاتی ہے اور اور وہ اپنے آپ کو وجد کی سی کیفیت میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔

دوطرفہ سعادت

آج جب وہ بھیج پاگارا کا نعرہ بلند کر رہے تھے تو ان کے دل دو گنے جوش مسرت سے معمور تھے۔ اول تو یہ کہ آج ان کا محبوب بنفسِ نفیس ان کے درمیان موجود تھا۔ ان کا پیر طریقت۔ ان کا ہادی و رہبر ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کی تمناؤں کا ثمر اور ان کی دعاؤں کا اثر۔ آج ان کے محبوب کا رخِ انور ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان کی نگاہیں اس کا طواف کر رہی تھیں اور وہ اپنے آپ کو ہفت اقلیم کے شہنشاہ سے بڑھکر خوش نصیب تصور کر رہے تھے۔ اور دوم یہ کہ آج برسوں کے بعد ان کی دلی مراد بر آئی تھی۔ مدتوں کے بعد ان کو کفر سے نبرد آزمائی کا موقعہ ملا تھا۔ انگریز نہ سہی، ہندو سہی الکفر ملۃ واحدۃ۔ کفر کا حسب ونسب ایک ہی ہے صرف نام مختلف ہیں۔ القاب الگ الگ ہیں اصل و نسل میں کوئی فرق نہیں ہے کفر کا اصل ونسل کفر ہی ہے۔ آج ان کو باطل کے خون سے اپنی مجاہدانہ آرزوؤں کی پیاس بجھانی تھی۔ غازیوں اور شہدا کی صف میں شامل ہو کر اللہ اور اللہ کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنی تھی اور اپنے محبوب رہبر اور پیر طریقت کے حکم کی تعمیل کر کے دنیا و عقبیٰ میں سرخرو و سربلند ہونا تھا۔ اس لئے آج اپنی خوش قسمتی اور بلند بختی پر نازاں وشاداں تھے اور بھیج پاگارا کے نعرے لگا کر اپنے جوش مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ عین ان نعروں کے درمیان حضرت پیر سائیں نے ان کو حسب ذیل خطاب سے نوازا :-

میرے پیارے حر مجاہدو! ہم خوش نصیب ہیں کہ آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں جہاد کا موقعہ عطا فرمایا ہے۔ ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے آج کافر اپنے لشکر اور اسلحہ کے غرور میں ہم پر حملہ آور ہوا ہے تاکہ ہم کو برباد اور ہمارے وطن کو تباہ کرے۔ اس لئے تم آگے بڑھو اور اسلام۔ ملک اور قوم کی عزت و ناموس اور بقا کے لئے مردانہ وار مقابلہ کرو۔ دیکھنا۔ تمہارے قدم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔ دشمن پر

بھرپور حملہ کرو اور فتح حاصل ہونے تک لڑتے رہو۔ بوڑھوں، عورتوں بچوں اور معذوروں پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ تمہارا محافظ ہے۔

مجاہدین کی قیادت

حُر جہاد کے لئے پہلے ہی تڑپ رہے تھے لیکن حضرت پیر سائیں کے فرمان واجب الاذعان ان میں مزید تڑپ پیدا کر دی۔ ان کے سالار اعلیٰ خود حضرت پیر سائیں تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے محاذ جنگ میں کیمپ لگا کر بنفس نفیس موجود رہے۔ ان کے حکم پر بیس ہزار حُر فوراً محاذ پر حاضر ہو کر جنگ میں شریک ہو گئے۔ اگرچہ حُر حضرت پیر سائیں کی ہدایت پر پاکستانی افواج کے ساتھ بھرپور تعاون اور فوجی حکام کے احکام کی پوری پوری تعمیل کر رہے تھے لیکن خود تجربہ کار فوجی حکام ان کی جنگی حکمت عملی دیکھکر حیرت زدہ رہ گئے اور انہیں خوشی سے اجازت دیدی کہ وہ اپنے کمانڈروں کی کمان میں رہ کر جو حکمت عملی مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔ چنانچہ فقیر محمد امین منگریو حُر مجاہدین کے منتظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور کچھ کے رَن سے لیکر رحیم یار خان تک تمام جنگی سرگرمیوں کی نگرانی کرتے رہے۔ فقیر محمد امین نے جس مہارت، خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ ان سے فوجی حکام بھی بہت متاثر اور مطمئن تھے۔

حُر مجاہدین کی فتوحات

بھارت اس سے پہلے بھی کچھ کے رَن اور کنجھر کوٹ میں حر مجاہدین کے جوہر دیکھ چکا تھا۔ اب جو حر مجاہدین "بھیج یا گادرا" کے نعرے لگاتے ہوئے پھر میدان کارزار میں اُترے تو بھارت چوکنا ہو گیا اور اپنی فوج کو مزید اسلحہ اور فوجی چوکیوں کو جدید جنگی ساز و سامان سے لیس کر دیا۔ لیکن بھارت کو اس مستعدی اور مزید اسلحہ بندی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا حر مجاہدین نے اس کی متعدد اہم چوکیوں، قلعوں اور شہروں پر قبضہ کر کے بارہ سو مربع میل کا علاقہ فتح کر لیا۔

فقیر محمد امین منگریو کے فوجی انتظامات، حر مجاہدین کی بھارتی فوجی چوکیوں

اور قلعوں پر یلغار، شاندار فتوحات، بھارت کے فوجی اسلحہ ٹینکوں، توپوں اور دیگر جدید ساز و سامان پر قبضہ، بھارتی فوجی سپاہیوں اور فوجی حکام کی شکست، موت فرار اور گرفتاریوں کی تمام تفصیلات اس تذکرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں جو مصنف نے بڑی کاوش اور تحقیق سے جمع کی ہیں اور یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس معرکہ میں کتنے حُر مجاہدین درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور پاکستان کی آن اور حضرت پیر سائیں کے فرمان پر ہنسی خوشی قربان ہو گئے۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں حر مجاہدین کے منتظم اعلیٰ فقیر محمد امین منگریو ہی تھے۔ مصنف نے ان حر مجاہدین کی فہرست بھی پیش کی ہے جنہوں نے فقیر صاحب کے زیر کمان دونوں جنگوں میں نمایاں خدمات انجام دیں یا جنہوں نے حر مجاہدین کو بھرتی کرنے، محاذ تک پہنچانے، ان کی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کے خاندانوں کو سنبھالنے کی ذمہ داریاں اپنے اوپر ہموار کی تھیں۔

شجاعت کا اعتراف

حر مجاہدین کی ان سرفروشانہ خدمات اور مجاہدانہ کارناموں کو تمام لوگوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے جن میں غیر ملکی نامہ نگار بھی شامل ہیں۔ سندھی کے شعرائے کرام نے افواج پاکستان کے ساتھ ساتھ ان کو بھی خوب داد دی اور ان کی بہادرانہ کارگذاریوں کی دل کھولکر تعریف کی۔ خود بھارتی فوجی حکام نے بھی ان کی مردانگی اور شجاعت کا اعتراف کیا ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کرکے حضرت پیر پاگارو شاہ مردان شاہ ثانی کی خدمات کو سراہا اور ان کو "ہلال پاکستان" کا تمغہ دیا۔ اور فقیر امین منگریو کو بھی "ستارۂ جرأت" کا تمغہ دیا گیا۔

پیر صاحب کی بے لوث خدمت

لیکن حضرت پیر سائیں کی ذات والاصفات ان اعترافات اور انعامات سے بالاتر ہے انہوں نے ان جنگوں میں پاکستانی افواج کے ساتھ جو تعاون کیا وہ کسی صلہ کی خاطر نہیں تھا بلکہ پاکستان کی آزادی اور اس کی سرحدات کی سالمیت کے لئے تھا۔ حضرت پیر سائیں

ایک سچے اور عظیم محب وطن ہیں. پاکستان ان کا اپنا وطن ہے اور وہ اپنے وطن کی خدمت کرنا اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں۔ ان کا دل حب الوطنی کے جذبہ سے اسقدر معمور ہے کہ وہ اس کے تحفظ کے لیے جان کی قربانی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اس سلسلہ میں ان کا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے ؎

سر سینکڑوں جہاں میں سروں کی کمی نہیں
اس آستاں کی خیر ہو، یہ آستاں رہے

تذکرہ کے مصنف اس بات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

آپ کو افسوس صرف اس بات پر ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ان کے مریدوں کو اپنے جوہر دکھانے کے (پورے) مواقع نہ مل سکے اور سازشوں کی وجہ سے حر مجاہدین تو کیا، خود مسلح افواج بھی اپنا کردار ادا نہ کر سکیں۔

حضرت پیر سائیں کی خدمات جلیلہ اور حُر مجاہدین کی ناقابل فراموش قربانیوں کو سراہنے کے سلسلہ میں صرف ایک اخبار روزنامہ "جسارت" (مؤرخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء) کے ایک مضمون کے حسب ذیل اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

حصول آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے پیر پاگارو کی گدی بحال کی اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ واپس وطن لایا گیا پیر پاگارو نے اپنی شاندار خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی تمام توانائیاں مملکت خداداد پاکستان کی حفاظت و ترقی کے لئے وقف کر دیں۔ انہوں نے پاکستان کے دفاع کو اپنا نصب العین بنایا اور ہماری ۲۵ سالہ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سندھ کے محاذ پر بھارت سے اب تک چھوٹی بڑی جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان سب میں حر مجاہدین ہماری فوج کے شانہ بشانہ داد شجاعت لیتے اور ملک کی مقدس سرزمین پر جانیں نچھاور کرتے رہے ہیں۔ حُروں کی یہ عظیم

قربانیاں ان کے روحانی پیشوا پیر صاحب پاگارو کی ہدایت ورہنمائی کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں حروں نے جسطرح سندھ محاذ کو سنبھالا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ آج بھی سندھ کی سرحدوں پر ہزاروں حر مادر وطن کی سرحدوں پر دشمن کے لئے ایک ناقابل تسخیر چٹان بنے کھڑے ہیں۔

پیر صاحب پاگارو اپنی انہی خدمات کے باعث پاکستان بھر میں اور بالخصوص سندھ کے اندر انتہائی قدر و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں

حالات کی ستم ظریفی

ایک طرف تو حضرت پیر سائیں کی خدمات کے اعتراف میں قومی اسمبلی کی قرار داد، پچھلی حکومتوں کی طرف سے آپ کے لئے اور آپ کے خلیفہ فقیر محمد امین منگریو کے لئے تمغہ جات ہیں اور عوام اور عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کے ترجمان اخبارات حر مجاہدین کو ان کی بے لوث خدمات اور عظیم قربانیوں پر خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ماضی قریب میں حضرت پیر سائیں اور ان کی جماعت (حروں) کے خلاف وہی رویہ اختیار کیا گیا جو انگریز نے اختیار کر رکھا تھا۔ فقیر محمد امین منگریو جیسے غازی اور مجاہد کو دو مرتبہ ڈی۔ پی۔ آر کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اب وہ عدم پیدا ہیں اور کسی کو بھی پتہ نہیں ہے کہ وہ زندہ ہیں یا ڈی۔ پی۔ آر۔ کا لقمہ بن گئے

حضرت پیر سائیں کے خلاف جو کچھ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں پھر "جسارت" ہی کے اسی مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

> موجودہ حکومت نے گذشتہ دنوں جب اس محب وطن اور اسلام دوست شخصیت کو اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے تراشیدہ "لندن پلان" میں ملوث کیا اور ڈپٹی کمشنر خیرپور کے ذریعہ بھیجے جانے والے اظہار وجوہ کے نوٹس میں ان پر ملک دشمنی اور غداری جیسے سنگین الزامات لگائے تو ہر پاکستانی تڑپ اٹھا اور حکومت کے

اس اقدام پر چاروں طرف سے مذمت اور ملامت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پیر صاحب نے اس موقع پر غیر معمولی صبر و تحمل کا ثبوت دیا اور ایک پابند قانون شہری کی حیثیت سے حکومت کو لکھ بھیجا کہ "آپ سے عدالت میں ملاقات ہو گی"۔

اب اس ستم ظریفی پر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ :-

برعکس نہند نام زنگی کافور

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگریز جاتے وقت اپنی استعماری ذہنیت یہیں چھوڑ گیا ہو اور اس کے لے پالک بچوں نے اسے ورثہ کے طور پر اپنا لیا ہو۔

یہ زمانہ کی نیرنگیاں ہیں کہ کبھی کبھی منزل ان لوگوں کو مل جاتی ہے جو شریک سفر نہیں ہوتے۔ اور یہ ان ہی نیرنگیوں کے کرشمے ہیں کہ دودھ پینے والے مجنوں عاشق کہلاتے ہیں اور خون دینے والے مجنوں رقیب گردانے جاتے ہیں۔ جہاں یہ صورت حال ہو وہاں اگر نگاہوں کے زاویے بدل جائیں اور سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہا جائے تو ناممکن نہیں ہے۔

دین اور سیاست کا امتزاج

اس مقدمہ کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ "اسلام عقائد، عبادات اور معاملات پر مشتمل ایک ضابطۂ حیات ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ایک مکمل نظام۔ اسلام انسانی زندگی کو تقسیم نہیں کرتا اور دین کو سیاست سے الگ نہیں سمجھتا"۔

اس بنیادی حقیقت کو مدنظر رکھکر غور کیا جائے گا تو صاف نظر آئے گا کہ ماضی میں برصغیر پاک و ہند کے اندر جتنی بھی انقلابی تحریکیں اٹھیں وہ بیک وقت دین اور سیاست کی حامل تھیں۔ حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی کی تحریک ہو، حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک ہو، پاگارہ خاندان کی حر تحریک ہو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک مجاہدین ہو، تحریک خلافت ہو یا موجودہ دور کی اصلاحی

اور اسلامی تحریکیں ہوں ۔ ان میں دین اور سیاست کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور سب کی سب گویا ایک ہی سلسلہ کی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان سب کا مقصد ایک ہی رہا ہے یعنی احیائے اسلام اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام ۔

مفاد پرست قوتیں ہمیشہ ان تحریکوں کے خلاف رہی ہیں اور غلط فہمیاں پھیلا کر عوام کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں ۔ ان تحریکوں کے مرکز چونکہ مسجدیں درسگاہیں اور خانقاہیں رہی ہیں ۔ اور ان کے داعی اور پیشوا دیندار لوگ ہیں اس لئے مفاد پرست قوتیں ان کے خلاف عوام کو یہ "تاثر" دینے میں آسانی سمجھتی ہیں کہ " دینی مرکزوں اور دیندار لوگوں کا کام دین کی خدمت کرنا ہے ، نہ کہ سیاست میں دخل دینا اس کا مطلب یہ ہوا کہ داعیانِ حق مسجدوں کے حجروں میں بیٹھ جائیں اور نظامِ حکومت ایسے لوگوں کے حوالے کر دیں جو اللہ کی حاکمیت کے بجائے اپنی حاکمیت کے قائل ہوں اور اسے عوام سے فریب کاری اور دھاندلی سے منوانا چاہتے ہوں ۔

پیر صاحب کی سیاست سے وابستگی

مذکورہ بالا حقائق کی بنا پر پاگارہ خاندان نے سیاست سے کبھی کنارہ کشی نہیں کی اور تمام داعیانِ حق کی طرح سیاست میں ہمیشہ تعمیری کردار ادا کرتا رہا ۔ زیرِ نظر تذکرہ میں مصنف نے پاگارہ خاندان کی دینی ، ملکی ، علمی ، ادبی اور دیگر خدمات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کے اسی تعمیری کردار کا ذکر بھی وضاحت سے کیا ہے اور جہاں تک موجودہ پیر پاگارو حضرت شاہ مردان شاہ ثانی کے حالات کا تعلق ہے مصنف نے ان کے دینی ، ملکی اور قومی پہلوؤں پر روشنی ضرور ڈالی ہے لیکن ان کے سیاسی کردار کو اجاگر کرنے سے چونکہ مصلحتاً احتراز کیا ہے ۔ اس لئے اس مقدمہ میں اس کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ تذکرہ تشنہ نہ رہ جائے ۔

حضرت پیر سائیں دینی علوم کی تعلیم کو فروغ دینے ، ملک میں امن قائم کرنے ملک کی نظریاتی اور سیاسی سرحدات کی حفاظت کرنے اور دیگر معاشرتی خدمات انجام دینے کے علاوہ ملک کے اندر جمہوری نظام کی بحالی ۔ قانون کی بالادستی اور آمریت کے

سد باب کے لئے بھی کوشاں رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کے اسی رجحان اور کردار کے پیش نظر حزب اختلاف کی مختلف الخیال جماعتوں نے "متحدہ جمہوری محاذ" کی قیادت کے لئے آپ ہی کو موزوں ترین شخصیت سمجھا۔

لادینی رجحانات کی مخالفت

حضرت پیر سائیں کا ایک اور خصوصی کردار جس کی وضاحت کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ آپ ملک کے اندر ابھرنے والے تمام غیر اسلامی رجحانات کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں۔ سندھ میں کمیونسٹ تحریکیں بھی پوشیدہ یا غیر پوشیدہ طور پر کام کرتی رہی ہیں۔ محدود قومیت پرستی کے رجحانات بھی جڑ پکڑتے رہے ہیں۔ ڈاہر پرستی اور سندھو دیش جیسی مہلک اور تباہ کن تحریکیں بھی جنم لیتی رہی ہیں۔ لیکن ان تمام غیر اسلامی تحریکوں کو روکنے میں حضرت پیر سائیں کی خدمات نمایاں اور موثر ثابت ہوئی ہیں۔ آپ نے ۱۹۵۶ء میں "مہران" کے نام سے ایک سندھی روزنامہ جاری کیا۔ جس کا ۱۹۵۷ء سے لیکر اب تک راقم الحروف ایڈیٹر رہا ہے۔ اس اخبار نے حضرت پیر سائیں کی ہدایت پر پوری قوت کے ساتھ ان تحریکوں کی مخالفت کی اور اہل سندھ کو ان تحریکوں کے تباہ کن اثرات سے مسلسل آگاہ کرتا رہا۔ یہ حضرت پیر سائیں اور ان کی جماعت (حر دں) ہی کی قوت ہے جو ان تحریکوں کے سامنے فولادی دیوار بنی کھڑی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان دشمن اندرونی اور بیرونی قوتیں ان غیر اسلامی تحریکوں کی راہ میں حائل اس فولادی دیوار کو گرانے کے درپے نظر آتی ہیں۔

پیر صاحب کا سیاسی نقطۂ نگاہ

حضرت پیر سائیں اگرچہ پاکستان کی مجموعی اور مرکزی قومیت میں یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بقاء اور استحکام کا راز اس میں مضمر ہے کہ تمام صوبے آپس میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح منسلک ہوں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے کے بھائی بنکر رہیں۔ تاہم وہ چاہتے ہیں کہ ہر صوبہ دوسرے صوبہ کا استحصال کرنے سے گریز کرے اور تمام صوبوں کو ان کے جائز حقوق ملنے چاہئیں۔ ان کا یہ نظریہ پاکستان کی وحدت

اور مختلف صوبوں کے حقوق کی حفاظت کے لیۓ ضمانت کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام محب وطن پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اہل سندھ چونکہ پاکستان کے دیگر صوبوں کے باشندگان کی طرح محب وطن ہیں۔ اس لئے حضرت پیر سائیں کے اس نظریہ کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ویسے بھی یہ حضرت پیر سائیں ہی کی ذات گرامی ہے جو پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ باشندگان سندھ کے ناموس اور وقار کے تحفظ کے لیۓ قربانیاں پیش کرتی رہی ہے۔ اس لئے اگر اہل سندھ ان کے نظریہ کی قدر کرتے ہیں تو یہ ایک قدرتی امر ہے۔

بنگلہ دیش کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر بھارت کا غلام بنجانے کے بعد تو حضرت پیر سائیں کے اس نظریہ کو اور بھی تقویت ملی ہے کہ سندھ کا مستقبل صرف پاکستان ہی کے ساتھ وابستہ ہے ورنہ تباہی، رسوائی اور غلامی کے سوا کسی اور چیز کی توقع رکھنا بالکل فضول ہے۔

ذاتی اوصاف

حضرت پیر پاگارو شاہ مردان شاہ ثانی کی ذات جامع الصفات اپنے اوصاف میں اپنی مثال آپ ہیں۔ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ایسے اخلاق وکردار اور گوناگوں صفات کے حامل بہت کم لوگ ہوں گے۔

آپ دیندار اور نیکوکار مسلمان ہیں۔ ایک شریف ونجیب انسان میں جو صفات ہونی چاہئیں وہ سب آپ کی ذات میں موجود ہیں۔ آپ مہذب، متمدن، روشن خیال وسیع القلب اور وسیع النظر انسان ہیں، ذہین، سخن فہم، نکتہ رس، خلیق، کریم النفس اور انتہا درجہ کے متحمل مزاج ہیں۔ آپ اپنے والد ماجد حضرت شہید کی طرح رحمدل نرم خو اور ساتھ ہی ساتھ بڑے غیور، حوصلہ مند، حق گو، مستقل مزاج اور بیباک ہیں۔ آپ راستباز اور حق وصداقت کا پیکر ہیں۔ آپ کا فکر ونظر وہی ہے جو آپکے آباؤ اجداد کا تھا۔ آپ اپنی تمام خاندانی روایات اور اوصاف کے امین ولقیب ہیں۔ آپ نے ماضی میں جس خلوص اور بلند حوصلگی کے ساتھ ملک وملت کی برتری

اور بہتری کے لئے عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ مستقبل میں بھی آپ کی ذات والاصفات سے اہلِ وطن کو ایسی ہی توقعات وابستہ رکھنی چاہئیں ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

پاگارہ خاندان کی امتیازی خصوصیات

پاگارہ خاندان کے عظیم المرتبت مشائخ ایسی امتیازی خصوصیات کے حامل رہے ہیں جو بالکل طبعی اور فطری ہیں اور جن کا کسی اور فرد یا خاندان میں یکجا ہونا مشکل ہے :۔

(۱) سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک دیندار خاندان ہے جس کا شعار تقویٰ عبادت گذاری اور سنت نبوی کی متابعت رہا ہے۔

(۲) اس خاندان نے شروع سے اب تک تبلیغ دین، رشد و ہدایت اور اپنے پیروؤں کی سیرت و کردار کو سنوارنے کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کی ہوئی ہے۔

(۳) یہ خاندان غازیوں اور مجاہدوں کا خاندان ہے۔ اقامت دین ہو یا حفاظت وطن ہمیشہ سربکف رہا ہے۔ انگریز کے خلاف یہی خاندان شروع سے لیکر اخیر تک صف آرا رہا اور بھارت کی یلغار کے مقابلہ میں اسی خاندان نے پاک افواج کا ساتھ دیا

(۴) دینداری، اشاعت اسلام اور غزا و جہاد کے ساتھ ساتھ اس خاندان کی جو اہم ترین خصوصیت رہی ہے وہ اس کا جود و کرم اور سخاو عطا ہے۔ اس خاندان کی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کبھی کوئی سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ گیا ہو یا اسے اسکی طلب اور توقع سے بڑھکر نہ نوازا گیا ہو۔ اس خاندان کی سخا و عطا کی روایات ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ان میں بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے مسلمان سلاطین ہند کی داد و دہش کی یاد تازہ ہو جاتی ہیں۔

(۵) یہ خاندان خود بھی اہل علم و فضل ہے اور علما و فضلا کی حوصلہ افزائی اور قدردانی بھی کرتا رہا ہے۔ علم دوستی اور ادب پروری اس کا شیوہ رہا ہے۔ پیر گوٹھ

ہیں سال بسال ۲۷، رجب کو جو عظیم اجتماع ہوتا ہے ۔ ان میں صرف اس کے مریدہی لاکھوں کی تعداد میں شریک نہیں ہوتے، بلکہ ہزاروں اہلِ علم و فضل اور ادباؤ شعرا کو بھی مدعو کیا جاتا ہے اور ان کی توقعات سے بڑھکر ان کی قدر افزائی کی جاتی ہے۔

(۶) یہ ایک جوہر شناس خاندان ہے۔ کسی شخص میں کوئی غیر معمولی فضیلت دیکھی تو اس کی سرپرستی کی اور تا حیات اس پر عنایات و نوازشات کی بارش ہوتی رہی۔

(۷) یہ خاندان اور اس کے مرید بہادر اور مردِ میدان ہونے کے باوجود امن پسند رہے۔ کبھی فرقہ وارانہ فسادات میں حصّہ نہیں لیا۔ ان علاقوں میں جہاں ان کی آبادیاں ہیں کبھی فساد ہونے نہیں دیا۔ اگر کہیں کسی شورش برپا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوا تو صلح و صفائی کراکے اس کو وہیں ختم کر دیا۔ خود مریدوں میں کبھی کوئی شوریدہ سر پیدا ہوا تو اسے امن پسندی کی تلقین کی گئی۔ اس کے بعد بھی اگر اس کی شوریدہ سری ختم نہ ہوئی تو اسے قانون کے سپرد کر دیا گیا۔

حرفِ آخر

پاگارہ خاندان کی تاریخ قارئین کرام کے سامنے ہے۔ یہ تاریخ اس قابلِ احترام اور لائق صد افتخار خاندان کے مشائخ عظام کے تعارف کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ اگرچہ اسمیں ان کے حالات و کوائف پوری تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کئے جا سکے۔ تاہم اس تاریخ کے آئینہ میں ان کی ذات و صفات کی چند جھلکیاں نظر آتی ہیں، انہیں دیکھکر

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

کے مصداق ان کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس برگزیدہ خاندان نے تبلیغ اسلام۔ رشد و ہدایت۔ اور علمی۔ ادبی اور معاشرتی خدمات کے علاوہ حفاظت دین اور آزادی وطن کے لئے جو جہاد کیا ہے اور حق کی راہ میں جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ پاک و ہند کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے تاریخ نا مکمل رہتی ہے اور تاریخ کی تکمیل کا تقاضہ یہ ہے کہ اس خاندان کی تمام دینی اور وطنی خدمات کو نہ صرف تاریخ کا جز و لاینفک سمجھا جائے۔ بلکہ انہیں تاریخ میں وہ مقام دیا

جائے جس کی وہ مستحق ہیں۔

انگریز جو اس خاندان کا حریف، بلکہ بدترین دشمن تھا۔ اس کا دور ختم ہو چکا، اس کے دور میں اس خاندان کے اصل حقائق کے اظہار کے لئے قلم اٹھاتے ہوئے اہل قلم کے ہاتھوں پر جو رعشہ طاری ہو جاتا تھا۔ اب اس کا اندیشہ نہیں رہا۔ اب پاگارہ خاندان کے بارے میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ زیر نظر تذکرہ اس سلسلہ کی، اس اعتبار سے ایک اہم ترین کڑی ہے کہ یہ پہلی بار ایک کتاب کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس سے قبل بعض دانشوروں نے چند مضامین بھی قلمبند کئے ہیں جو اپنے مندرجات کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ امید ہے کہ اس سلسلہ کو وسعت دی جائے گی اور اس برگزیدہ خاندان کے تمام مشائخ کے تفصیلی حالات وکوائف پر روشنی ڈالی جائے گی، خصوصاً ان دو تاریخ ساز اور عہد آفرین شخصیتوں حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول اور حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر اور نمایاں کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے گی، نیز ان منتشر مضامین کو جو مختلف اوقات میں قلمبند کئے گئے ہیں یکجا کرکے کتابی صورت دی جائے گی۔

پاگارہ خاندان کے حالات، عزائم اور کارناموں پر غور کیا جاتا ہے تو اقبال کا یہ شعر اس کی پوری پوری آئینہ داری کرتا نظر آتا ہے ؎

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

فقط ۲۲ر اپریل ۱۹۷۵ء

خادم دین
سردار علی شاہ

بابِ اوّل

پاگارہ خاندان کا تعارف، ان کا حسب نسب اور سلسلۂ طریقت

شجرۂ نسب حضرت پیر سائیں پاگارو مدظلہٗ

۱ - حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

۲ حضرت امام حسین 〃

۳ حضرت امام زین العابدین 〃

۴ حضرت امام باقر 〃

۵ حضرت امام جعفر صادق 〃

۶ حضرت امام موسیٰ کاظم 〃

۷ حضرت امام علی رضا 〃

۸ شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ

۹ شاہ عبداللہ 〃

۱۰ شاہ ہارون 〃

۱۱ شاہ حمزہ 〃

۱۲ شاہ عمر 〃

۱۳ شاہ اسداللہ 〃

۱۴ شاہ زید 〃

۱۵ شاہ عباس 〃

۱۶ شاہ علی مکّی لکیاری (جو سندھ میں آئے ہوئے)

۱۷ شاہ چھکن رحمتہ اللہ علیہ

۱۸ شاہ حسین 〃

۱۹ شاہ محمد 〃

۲۰ شاہ محمود 〃

۲۱ شاہ بہاؤالدین 〃

۲۲ شاہ شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ

۲۳ شاہ فضل اللہ 〃

۲۴ شاہ عباس 〃

۲۵ شاہ ناصرالدین 〃

۲۶ شاہ میر علی 〃

۲۷ شاہ حسین 〃

۲۸ شاہ بولن 〃

۲۹ شاہ سنجر 〃

۳۰ شاہ کھٹن 〃

۳۱ شاہ عثمان 〃

۳۲ شکراللہ شاہ 〃

۳۳ فتح محمد شاہ 〃

۳۴ محمد امام شاہ 〃

۳۵ سیّد محمد بقا شہید 〃

۳۶ سیّد محمد راشد 〃

۳۷ سیّد صبغت اللہ شاہ اوّل المعروف بہ پیر پاگارو نمبر ۱

۳۸ سید علی گوہر شاہ اولؒ پیر پاگارو نمبر ۲

۳۹ سید حزب اللہ شاہ ؒ پیر پاگارو نمبر ۳

۴۰ سید علی گوہر شاہ ؒ ثانی پیر پاگارو نمبر ۴

۴۱ سید شاہ مردان شاہ اولؒ پیر پاگارو نمبر ۵

۴۲ سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ پیر پاگارو نمبر ۶

۴۳ سید سکندر علی شاہ

الملقب بہ شاہ مردان شاہ ثانی

(موجودہ پیر پاگارو نمبر ۷)

القابات و تاریخہائے اموات

۱ حضرت سید محمد بقا شہیدؒ — سنہ ۱۱۹۸ھ

۲ حضرت سید محمد راشدؒ الملقب بہ روضے دھنی یکم شعبان سنہ ۱۲۳۳ھ بمطابق ۴ جون سنہ ۱۸۱۸ء

۳ حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول الملقب بہ پیر پاگارو — ۵ رمضان سنہ ۱۲۴۶ھ بمطابق ۸ فروری سنہ ۱۸۳۱ء

۴ حضرت سید علی گوہر شاہ اولؒ الملقب بہ بنگلے دھنی — ۱۱ جمادی الاول سنہ ۱۲۶۳ھ بمطابق ۲۸ اپریل سنہ ۱۸۴۷ء

۵ حضرت سید حزب اللہ شاہؒ الملقب بہ تخت دھنی — ۲ محرم سنہ ۱۳۰۸ھ بمطابق ۲۱ اگست سنہ ۱۸۹۰ء

۶ حضرت سید علی گوہر شاہ ثانیؒ الملقب بہ محفہ دھنی — محرم سنہ ۱۳۱۴ھ بمطابق سنہ ۱۸۹۶ء

۷ حضرت سید شاہ مردان شاہ اولؒ الملقب بہ کوٹ دھنی — ۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۰ھ بمطابق ۹ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء

۸ حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ الملقب بہ پگ دھنی — ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء

بعض الفاظ کی تشریح

روضے دھنی	مقبرے والا
پاگارو	پگڑی والا
بنگلے دھنی	بنگلے والا
تخت دھنی	تخت والا
محفہ دھنی	پالکی والا
کوٹ دھنی	فصیل والا
پگ دھنی	صاحبِ دستار

تصوّف

اس کتاب کے موضوع اور آئندہ ابواب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگانا اس وقت تک مشکل ہے جب تک آپ تصوّف کو نہ سمجھیں۔ کیونکہ جن بزرگوں نے تصوّف کے ذریعہ خلقِ خدا کی روحانی اور اخلاقی تربیت کر کے اُنہیں اوجِ ثُریّا تک پہنچایا ہے۔ ان کی خدمات کا جائزہ لینا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم تصوّف کی مختلف منزلوں سے واقف ہوں۔

ذیل میں ہم مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ایک کتاب "دینیات" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں تصوّف کی ماہیّت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

"فقہ کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے۔ تم کو جیسا اور جس طرح حکم دیا گیا تھا۔ اس کو تم بجا لائے یا نہیں۔ اگر بجا لائے ہو۔ تو فقہ کو اس سے بحث نہیں کہ تمہارے دل کا کیا حال تھا۔ دل کے حال سے جو چیز بحث کرتی ہے اس کا نام تصوّف ہے۔ مثلاً تم نماز پڑھتے ہو۔ اس عبادت میں فقہ صرف یہ دیکھتا ہے۔ کہ تم نے وضو ٹھیک کیا ہے۔ قبلہ رُو کھڑے ہوئے ہو

نماز کے تمام ارکان ادا کیئے ہیں جو چیزیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب پڑھ لی ہیں۔ اور جس وقت جتنی رکعتیں مقرر کی گئی ہیں ٹھیک اسی وقت اتنی ہی رکعتیں پڑھی ہیں۔ جب یہ سب تم نے کر دیا تو فقہ کی رُو سے تمہاری نماز پوری ہوگئی۔

لیکن تصوّف یہ دیکھتا ہے کہ اس عبادت میں تمہارے دل کا کیا حال رہا ہے۔ تم خدا کی طرف متوجہ ہوئے یا نہیں۔ تمہارا دل دنیا کے خیالات سے پاک ہوا یا نہیں۔ تمہارے اندر نماز سے خدا کا خوف اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین اور صرف اسی کی خوشنودی چاہنے کا جذبہ پیدا ہوا یا نہیں۔ اس نماز نے تمہاری روح کو کس قدر پاک کیا۔ تمہارے اخلاق کہاں تک دُرست کیئے۔ تم کو کس حد تک سچّا اور پکّا مسلمان بنا دیا۔ یہ تمام باتیں جو نماز کے اصل مقصد سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس قدر کمال کے ساتھ ہونگی۔ تصوّف کی نظر میں تمہاری نماز اتنی ہی کامل ہوگی۔

اس فرق کو تم ایک مثال سے اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہو۔ جب کوئی شخص تم سے ملتا ہے تو تم اس پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہو۔ ایک حیثیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ صحیح و تندرست ہے یا نہیں۔ اندھا۔ لنگڑا لُولا تو نہیں ہے۔ خوبصورت ہے یا بدصورت۔ اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے یا میلا کچیلا ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق کیسے ہیں۔ اسکی عادات و خصائل کا کیا حال ہے۔ اسکی عقل اور سمجھ بوجھ کیسی ہے وہ عالم ہے یا جاہل۔ نیک ہے یا بد۔ ان میں سے پہلی نظر گویا فقہ کی نظر ہے اور دوسری نظر گویا تصوّف کی نظر ہے۔

دوستی کے لئے جب تم کسی شخص کو پسند کرنا چاہو گے تو اسکی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو دیکھو گے۔ تمہاری یہ خواہش ہوگی کہ اس کا ظاہر بھی اچھا ہو اور باطن بھی اچھا۔

اسی طرح اسلام میں بھی پسندیدہ زندگی وہ ہے جس میں شریعت کے احکام کی پابندی ظاہر کے اعتبار سے بھی صحیح ہو اور باطن کے اعتبار سے بھی جس شخص کی ظاہری اطاعت درست ہے مگر باطن میں اطاعت کی روح نہیں ہے۔ اس کے عمل کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص خوبصورت ہو مگر مردہ ہو۔ اور جس شخص کے باطن میں تمام خوبیاں موجود ہوں مگر ظاہری اطاعت درست نہ ہو اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بہت شریف اور نیک ہو۔ مگر بدصورت اور اپاہج ہو

اس مثال سے تم کو فقہ اور تصوّف کا باہمی تعلق بھی معلوم ہوگیا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ بعد کے زمانوں میں علم اور اخلاق کے زوال نے جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ تصوّف کے پاک چشمے کو بھی گندہ کر دیا گیا۔ لوگوں نے طرح طرح کے غیر اسلامی فلسفے گمراہ قوموں سے سیکھے اور ان کو تصوّف کے نام سے اسلام میں داخل کر دیا۔ عجیب عجیب قسم کے عقیدوں اور طریقوں پر تصوف کا نام چسپاں کر دیا جنکی کوئی اصل قرآن اور حدیث میں نہیں ہے۔ پھر اس قسم کے لوگوں نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے بھی آزاد کر لیا وہ کہتے ہیں تصوّف کو شریعت سے کوئی واسطہ نہیں یہ کوچہ ہی دوسرا ہے۔ صوفی کو قانون اور قاعدوں کی پابندی سے کیا سروکار۔ اس قسم کی باتیں اکثر جاہل صوفیوں سے سننے میں آتی ہیں۔ مگر در اصل یہ بالکل

غلط ہیں۔ اسلام میں کسی ایسے تصوّف کی گنجائش نہیں ہے جو شریعت کے احکام سے بے تعلق ہو۔ کسی صوفی کو یہ حق نہیں کہ وہ نماز اور روزے اور حج و زکوٰۃ کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔ کوئی صوفی ان قوانین کے خلاف عمل کرنے کا حق نہیں رکھتا جو معاشرت اور معیشت۔ اخلاق اور معاملات۔ حقوق و فرائض اور حدود و حلال و حرام کے متعلق خدا اور رسولؐ نے بتلائے ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرتا ہو۔ اور آپ کے مقرر کئے ہوئے طریقہ کا پابند نہ ہو۔ وہ مسلمان صوفی کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔

تصوّف تو درحقیقت خدا اور رسول کی سچی محبت بلکہ عشق کا نام ہے۔ اور عشق کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے احکام اور اس کے رسول کی پیروی سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے۔

پس اسلامی تصوّف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ شریعت کے احکام کی انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجالانے اور اطاعت میں خدا کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے ہی کا نام تصوّف ہے۔

تصوّف اور کشف المحجوب

اسی ضمن میں ہم مزید وضاحت کے لئے آپ کی خدمت میں کشف المحجوب از سید علی ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوری کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ مایۂ ناز تصنیف تصوف کے موضوع پر متقدمین اور متاخرین کے نزدیک سند (AUTHORITY) کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت علی ہجویری

فرماتے ہیں :-

"شریعت کی مثال اگر جسم کی ہے۔ تو حقیقت کی مثال اِس کے اندر روح کی ہے۔ جس طرح روح اور جسم کے اتصال ہی سے انسان وجود میں آتا ہے اسی طرح سے حقیقت اور شریعت کے باہم اتصال سے ہی دین صورت پذیر ہوتا ہے۔ نہ شریعت حقیقت سے کوئی الگ شے ہے اور نہ حقیقت کا شریعت سے الگ کوئی وجود ہو سکتا ہے۔

ایسے لوگ ملحد ہیں۔ اور ان پر خدا کی لعنت ہو جو یہ کہتے ہیں کہ ولی شریعت کی پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔

کسی شخص سے خرق عادت کا ظہور اس کے برگزیدہ یا ولی ہونے کی قطعی دلیل نہیں ہے۔ کتاب و سنّت کا کامل اتباع ولایت کی ایک لازمی شرط ہے۔

شریعت کے علم کے بغیر نہ کوئی عالم کہلا سکتا ہے اور نہ صوفی نہ فقیر اور نہ ان میں سے کسی چیز کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

فقر کی اصل متاع دنیا کا ترک اور اس کی علیحدگی نہیں ہے۔ بلکہ دل کو اس کی محبت سے خالی اور بے نیاز کرنا ہے۔ تاکہ دنیا کی کسی متاع کا ہونا یا نہ ہونا اس کے نزدیک یکساں ہو۔

ذاتِ خداوندی کے سوا تمام چیزوں سے دل کو فارغ رکھنے کا نام فقر ہے۔

صوفی وہ ہے کہ جب بولے تو اس کی زبان پر حق جاری ہو اور جب خاموش ہو تو اس کے جسم کا رونگٹا رونگٹا زبانِ حال سے شہادت دے کہ اس کے اندر دنیا کی کوئی ہوس موجود نہیں ہے

" صوفی اس شخص کو کہتے ہیں ۔ جو اپنے آپ کو حق میں فنا کر دے اور اس کے اندر کوئی کدورت اور تیرگی باقی نہ رہے ۔ کیونکہ دین کی روح اور اسکی جان تو احکام الہٰی کی اخلاص و محبت کے ساتھ پیروی ہے "

" تصوّف نام ہے نفس اور حرص و ہوا کی غلامی سے آزاد ہونے کا باطل کے مقابلے پر مردانگی دکھانے کا ۔ دنیوی تکلفات کو ترک کر دینے کا ۔ اپنے مال کو دوسروں پر صرف کر دینے کا اور دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینے کا "

" تصوّف کل کا کل آداب و احکام کی پابندی کا نام ہے ۔ اور ہر مقام ۔ ہر وقت اور ہر حال کے لئے آداب و احکام متعیّن ہیں جو شخص ہر موقع اور محل کے آداب و احکام کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کرے تو وہ اس مرتبے کو پہنچ گیا جہاں آدمی کو پہنچنے کی تمنّا کرنی چاہیئے اور جس نے ان آداب و احکام کی پرواہ نہ کی اور ان کو ضائع کر دیا تو ایسا شخص اس مقام سے بہت دُور ہے جہاں بارگاہِ خداوندی میں باریابی کی اُمید کر سکے "

" دل کی محافظت اور پاسبانی اس وقت آدمی کر سکتا ہے جبکہ دل کو دوسرے تمام غموں اور ارمانوں سے فارغ کر کے صرف عقبیٰ کے غم اور ارمان کو اس میں آباد کرے ۔ جو شخص طریقت سے آشنا ہے اسکی قبائے امیرانہ بھی قبائے فقیرانہ کی طرح ہوتی ہے "

حضرت صدیق اکبر رضؓ دُعا کیا کرتے تھے :۔

" خدایا دنیا کو میرے لئے فراخ فرما لیکن اس کے چکر میں پھنسنے اور اس میں مبتلا ہونے سے مجھے بچا "

حضرت عمر فاروق رض فرماتے تھے :-

" جس گھر (دنیا) کی بنیاد ہی آزمائش پر رکھی گئی ہے اس میں آزمائش و بلا سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے "

حدیث قدسی میں آیا ہے :-

" میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے ۔ لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں ۔ پھر بھلا وہ اس کو یہاں کیسے پائیں گے "

حضرت عثمان رض کا قول ہے :-

" نجات اور کامیابی اس کی ہے ۔ جس نے اس دنیا کی فانی اور محدود زندگی اور متاع کے عوض آخرت کی دوامی زندگی اور غیر محدود متاع حاصل کر لی "

حضرت علی رض کا قول ہے :-

" اپنے اہل و عیال سے انہماک تیرا سب سے بڑا مشغلہ نہ بن جائے یاد رکھ اگر تیرے اہل و عیال خدا کے دوست ہیں تو اللہ پاک اپنے دوستوں کو کبھی ضائع نہیں فرمائیگا اور اگر وہ خدا کے دشمن ہیں ۔ تو اللہ پاک کے دشمنوں سے تجھے کیا سروکار "

حضرت مجدد الف ثانی رح فرماتے ہیں :-

" طریق صوفیا پر چلنے سے مقصود یہ ہے ۔ کہ شرعی معتقدات پر جو ایمان کی حقیقت ہیں ۔ یقین محکم حاصل ہو جائے ۔ اور فقہی احکام کے ادا کرنے میں آسانی میسر ہو نہ کہ اس کے سوا کچھ اور "

تصوف کی ضرورت

اس دنیا میں ہر انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ پُر سکون زندگی بسر کرے اور یہ اُسی

صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے سکون اور راحت کے معیار اور اس کے حصول کے ذرائع کی بجائے خالق اکبر سے رہنمائی حاصل کرے کیونکہ اس کا ارشاد ہے۔

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب

(اطمینان قلب تو اللہ کے ذکر میں ہے)

لیکن انسان اپنی فطری حیلہ جوئی کی بدولت خالقِ اکبر کے اس ارشاد سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے عورت۔ ثقافت۔ دولت۔ منشیات اور ماڈرن ازم کی بھول بھلیّوں میں سرگرداں ہے تاکہ وہاں سکون کو تلاش کر سکے۔ مگر چونکہ تلاش کا رُخ سرے سے ہی غلط ہے اس لیے سوائے محرومی اور ناکامی کے اور کچھ بھی نہ حاصل ہوتا ہے۔ نہ ہو سکتا ہے۔ پس تلاش کا رُخ متعیّن کرنے کے لئے ہمیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ سے توانائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہمارے افکار و نظریات اور اقوال و اعمال میں مادی اور روحانی توازن اور اعتدال پیدا ہو۔ اور ہم ہر قسم کی اخلاقی، روحانی۔ معاشی اور معاشرتی خرابیوں۔ پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات پا سکیں۔ جن کی آگ میں ہم ہر وقت جلتے رہتے ہیں۔

تصوّف کے تمام سلسلوں کا سرچشمہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور تصوّف ایک مستقل سائنس ہے جس نے تجربات، اور مشاہدات کی بنا پر روحانی حقائق کا اس طرح انکشاف کیا ہے۔ جس طرح سائنس دان دُوربین کی مدد سے کرۂ ارض سے کروڑوں میل دور سیّاروں کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اہل تصوّف بھی چشم باطن سے عرش کی بلندیوں تک دیکھتے ہیں۔ تحت الثّریٰ کی پہنائیوں تک ان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ جس طرح سائنسدان

خوردبین سے بظاہر نظر نہ آنے والے جرثوموں کو دیکھتے ہیں اسی طرح یہ اہلِ بصیرت ان بلاؤں کو دیکھتے ہیں۔ جو انسانوں کے جسم اور اس کے قلب و روح میں دوڑ رہی ہیں۔

تصوّف ایک قسم کی برق (ELECTRICITY) ہے۔ جو قلب میں قمقمے کی طرح روشنی پیدا کرتی۔ روح میں بالیدگی بڑھاتی اور فکر و نظر کی تطہیر کرتی ہے۔ اس سے غم چھٹ جاتے ہیں اور راحت و انبساط کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔

تصوّف کا طریقۂ کار

صوفیائے کرام کے تمام سلسلے تزکیۂ نفس کے لئے مراقبہ اور ذکر کی تلقین کرتے ہیں ان کے سامنے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا وہ دَور بطور نمونہ موجود ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں جا کر گھنٹوں۔ دنوں اور ہفتوں تک خاموشی اور تنہائی میں غور و فکر یعنی مراقبہ کیا کرتے تھے۔

جب انسان کا توحید پر یقین کامل ہو جاتا ہے اور آفاق و انفس میں خالقِ اکبر کی آیات کا مشاہدہ اس میں عبودیت کی روح پھونک دیتا ہے تو وہ اشاعتِ اسلام اور قیام حکومتِ الٰہیہ کی خاطر میدانِ عمل میں نکل آتا ہے اس کے حصول کے لئے صوفیائے کرام ذکر قلبی اور ذکر لسانی کی تلقین کرتے ہیں اور بالخصوص ذکر قلبی پر ان کی توجہ زیادہ تر مبذول رہتی ہے۔ کیونکہ تزکیۂ نفس کے لئے یہ مفید ترین نسخہ ہے۔

جب نفسیات کی روشنی میں آپ اس پر غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ جس چیز کا خیال آپ کے شعور میں مستقل اور گہرا مقام حاصل کر لیگا۔ آپ کی تمام صلاحیتیں اور قوتیں اس کے تابع ہو جائیں گی۔ کیونکہ

فعل ارادہ کا تابع ہوتا ہے۔ پس جس مقصد کی لگن زیادہ شدید ہوگی۔ اس کے حصول کے لئے تمام قوتیں مجتمع اور مرتکز ہو جائیں گی۔ اس لیئے ذکر قلبی اور ذکر لسانی کو اس کثرت سے جاری رکھا جاتا ہے۔ کہ زبان۔ دل۔ اور شعور سب ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور پھر بکثرت مشق اور تصور کے بعد خود بخود بلا کسی تکلّف اور ارادہ کے ذکر میں محو رہتے ہیں۔ اور جب یہ کیفیت دائمی ہو جاتی ہے تو سکونِ قلب کی دولت بھی مستقل طور پر حاصل ہو جاتی ہے۔

اس مقصد کے لئے فرصت کے اوقات میں یہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ کہ میرا دل اللہ اللہ پکار رہا ہے۔ شروع شروع میں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی بلکہ خیالات اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ مگر بار بار کے مجاہدہ اور مشق کے بعد یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ سارا کھیل CONCENTRATION اور FOCALIZATION کی عملی تفسیر ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس میں کیف اور سرور محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے حتیٰ کہ سخت مصائب بلکہ موت کی گھڑیوں میں بھی خالقِ اکبر کی یاد مسرور وشاداں رکھتی ہے۔ اس مشق سے دنیاوی کاموں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا کیونکہ "دل بیار و دست بکار" والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور محبوب کے خیال کی مانند یہ شعور CONSCIOUS اور لاشعور SUB-CONSCIOUS پر غلبہ کر لیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ذکر کا جاری رکھنا تحت الشعور کی ڈیوٹی میں شامل ہو جاتا ہے۔ جیسے دل کی دھڑکن یا پھیپھڑوں کے سانس لینے کا عمل بلا کسی ارادہ کے خود بخود جاری رہتا ہے۔

جب یہ کیفیت راسخ ہو جاتی ہے تو قلب مصفّٰی ہو جاتا ہے۔ زبان ذکر سے تر رہتی ہے۔ چشم پُرنم ہو جاتی ہے۔ دل خدا کی محبّت سے لبریز ہو جاتا ہے

کبر و نخوت، حسد و غرور حُبِّ دنیا۔ اور حبِّ جاہ وغیرہ روحانی اور اخلاقی بیماریوں سے نجات ہو جاتی ہے۔ خلقِ خدا کا فائدہ مدِنظر رہتا ہے۔ مصیبت کے وقت صبر کرنے میں لذّت محسوس ہوتی ہے۔ غلطی پر ندامت ہوتی ہے۔ ایسے ہی دل کو قلبِ منیب کہتے ہیں اور خالقِ اکبر کو یہی دل پسند ہے۔ بقول ماہر القادری

اس دل پہ خدا کی رحمت ہے جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

اور علّامہ اقبالؔ نے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اس کے بعد یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز نہ میری ملکیت ہے۔ نہ کسی دوسرے کی بلکہ سب کچھ اللہ جلّ شانہٗ کی مِلک ہے۔ پھر اس حالت میں کسی چیز کے مل جانے کی خوشی اور جاتے رہنے کا غم ہرگز اثر انداز نہیں ہو سکتے اور یہی سکونِ قلب ہے۔ قرآنِ مجید میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(ترجمہ) وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے، پھر اس پر استقامت دکھائی انہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ غم)

یہی کیفیت طمانیت کہلاتی ہے۔ مگر اس تک پہنچنے کے لئے حلال کمائی اور ذکرِ الٰہی لازمی ہیں۔ ان کے بغیر اس کا تصوّر بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ تو واردات ہے مشاہدہ نہیں ہے۔ اور اس راستہ کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہونے کے لئے اہلِ تصوّف سے رابطہ ضروری ہے اور یہی حقیقت حافظ شیرازیؒ نے اس شعر میں بیان کی ہے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید ؛؛ کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزل ہا

تصوّف کے سلسلے

تصوّف کے چار مشہور سلسلے ہیں جن کی مختصر تشریح مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) **سلسلہ عالیہ نقشبندیہ** :- اس سلسلہ کے سرخیل حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اور اس کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے وسیلے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچتا ہے۔

(۲) **سلسلہ عالیہ قادریہ** :- اس سلسلہ کے سرخیل حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اور اس کا سلسلہ حضرت علی رضؓ کے وسیلے سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچتا ہے۔

(۳) **سلسلہ عالیہ سہروردیہ** :- اس سلسلہ کے سرخیل حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اور اس کا سلسلہ بھی حضرت علی رضؓ کے وسیلے سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچتا ہے۔

(۴) **سلسلہ عالیہ چشتیہ** :- اس سلسلہ کے سرخیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ ہیں اور اس کا سلسلہ بھی حضرت علی رضؓ کے وسیلے سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچتا ہے۔

ان تمام سلسلوں کے علاوہ اور بھی کئی سلسلے ہیں مگر وہ سب ان کی شاخیں ہیں۔ ان سلسلوں میں صرف نقشبندی سلسلہ میں ذکر خفی (بغیر آواز نکالے ذکر کرنا) ہوتا ہے۔ باقی دوسرے سلسلوں میں ذکر جہر (بلند آواز سے ذکر کرنا) کی تلقین کی جاتی ہے۔ مقصود ان تمام سلسلوں کا تزکیۂ نفس۔ تطہیر افکار۔ احیائے دین اور تبلیغ اسلام ہے۔ اگرچہ راستے مختلف ہیں۔

شجرے

ذیل میں ہم نقشبندی اور قادری سلسلے کے شجرے درج کرتے ہیں۔ تاکہ

اس موضوع کی تکمیل ہو سکے۔

شجرۂ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ

۱ حضور نبی اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
۲ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
۳ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
۴ حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
۵ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
۶ حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ
۷ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ
۸ حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی رحمۃ اللہ علیہ
۹ حضرت خواجہ ابویوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ
۱۰ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ
۱۱ حضرت خواجہ عارف رحمۃ اللہ علیہ
۱۲ حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ
۱۳ حضرت شیخ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ
۱۴ حضرت خواجہ محمد بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ
۱۵ حضرت خواجہ سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ
۱۶ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ
۱۷ حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ
۱۸ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ

۱۹ حضرت خواجہ محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ

۲۰ حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ

۲۱ حضرت خواجہ خواجگی امکنکی رحمۃ اللہ علیہ

۲۲ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

۲۳ حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی (مجدد الف ثانی) رحمۃ اللہ علیہ

۲۴ حضرت خواجہ سیّد آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ

۲۵ حضرت خواجہ سعدی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۲۶ حضرت خواجہ ایوب رحمۃ اللہ علیہ

۲۷ حضرت خواجہ جمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ

۲۸ حضرت مخدوم اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ

۲۹ حضرت خواجہ سیّد محمد بقا رحمۃ اللہ علیہ

۳۰ حضرت سیّد محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ

نوٹ :- آپ کے بعد اس خاندان کے پیران عظام سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوتے رہے۔

شجرۂ سلسلۂ قادریہ

۱ حضور نبی اکرم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم

۲ حضرت سیّدنا علی مرتضٰی رضی اللہ تعالٰی عنہ

۳ حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ تعالٰی عنہ

۴ حضرت خواجہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ

۵ حضرت خواجہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ

۶ حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ

۷ حضرت خواجہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ

۸ حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

۹ حضرت خواجہ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰ حضرت خواجہ عبدالواحد رحمۃ اللہ علیہ

۱۱ حضرت خواجہ ابوالفرح طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲ حضرت خواجہ علی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳ حضرت خواجہ ابی سعید المبارک رحمۃ اللہ علیہ

۱۴ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۵ حضرت خواجہ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ

۱۶ حضرت خواجہ صوفی رحمۃ اللہ علیہ

۱۷ حضرت خواجہ احمد رحمۃ اللہ علیہ

۱۸ حضرت خواجہ مسعود رحمۃ اللہ علیہ

۱۹ حضرت سید علی رحمۃ اللہ علیہ

۲۰ حضرت خواجہ شاہ میر رحمۃ اللہ علیہ

۲۱ حضرت خواجہ شمس الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ

۲۲ حضرت خواجہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ

۲۳ حضرت خواجہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

۲۴ حضرت خواجہ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ

۲۵ حضرت خواجہ حامد شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۲۶ حضرت خواجہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

۲۷ حضرت خواجہ شمس الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ

۲۸ حضرت خواجہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

۲۹ حضرت خواجہ شمس الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ

۳۰ حضرت خواجہ حامد شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۳۱ حضرت خواجہ شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ

۳۲ حضرت خواجہ صالح شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۳۳ حضرت سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

۳۴ حضرت سید محمد بقا رحمۃ اللہ علیہ

۳۵ حضرت سید محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ

۳۶ حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول رحمۃ اللہ علیہ (پہلے پیر پاگارو)

۳۷ حضرت سید علی گوہر شاہ اول رحمۃ اللہ علیہ

۳۸ حضرت سید حزب اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۳۹ حضرت سید علی گوہر شاہ ثانی رحمۃ اللہ علیہ

۴۰ حضرت سید شاہ مردان شاہ اول رحمۃ اللہ علیہ

۴۱ حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی رحمۃ اللہ علیہ

۴۲ حضرت سید شاہ مردان شاہ ثانی مدظلہٗ (پیر سکندر شاہ موجودہ پیر پاگارو)

بابِ دوم

(سیّد علی مکی رحمت اللہ علیہ سے رضے دھنی رحمت اللہ علیہ تک)

سیّد علی مکیؒ کا سندھ میں ورود مسعود

آپ اس سلسلہ کے پہلے بزرگ ہیں جو مکّہ معظمہ سے سندھ میں تشریف لائے۔ آپ کی آمد سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ہم ذیل میں ان روایات کو درج کرنے کے بعد تاریخ کی روشنی میں ان کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ تحفتہ الکرام کی روایت

تحفتہ الکرام سندھی ادب میں تاریخی لحاظ سے ایک بلند پایہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور قدیم تاریخ کے لئے ایک ماخذ کا کام دیتی ہے۔ اسکی روایت مندرجہ ذیل ہے۔

"سب سے پہلے جو سیّد یہاں (لکیاری) آئے۔ وہ سیّد علی بن سیّد عباس بن شاہ زید (امام موسیٰ کاظمؒ تک) تھے۔ کہتے ہیں کہ سید مذکور کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے دلو رائے کے ظلم کی وجہ سے اروڑ اور بہمن آباد (بھانبھرا) کے شہر ویران اور پامال ہو چکے تھے۔ (واضح ہو کہ بہمن آباد وہ جگہ ہے جو آج دلور کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے کھنڈرات اور آثار نہر جمڑاؤ کے کنارے جنوب مشرق کی طرف بھڑایا ڈڑا کے نام سے کئی میلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مصنف)

دلو رائے اپنے بھائی چھٹو امرانی کی ہدایت پر افعال بد سے تائب ہو کر بصد ندامت سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بیٹی کو سیّد صاحب کے عقد میں دے دیا جس سے چار فرزند پیدا ہوئے۔

۱- سیّد محمد ۲- سیّد مراد ۳- سیّد حاجی عرف بھرکیو ۴- سید چنگو جن سے چار قبیلے بن گئے۔

بعضوں کا کہنا ہے کہ دلورائے کا بھائی چھٹو آمرانی فریاد لیکر خلیفۂ بغداد کے پاس گیا تھا۔ اور مذکورہ سید کو سامرہ کے سو عرب باشندوں سمیت لیکر سندھ میں آیا تھا۔

اس کتاب میں وہ روایت بھی درج ہے جس کے مطابق چھٹو آمرانی کو عرب سے مدد لانے کی وجہ بھی بتائی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:-

"شہر اروڑ کی بربادی کے بعد دلورائے بھانبھرا (بہمن آباد) میں آکر رہنے لگا تھا۔ اس کا بھائی چھٹو آمرانی مسلمان ہوگیا تھا اس نے عرب میں جاکر اسلام کی شریعت اور قرآن مجید کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور اس سے فارغ ہوکر وہ بھی بہمن آباد میں آگیا تھا

اس کے اعزّہ نے اسے شادی کرلینے کے لئے بار بار کہا اور بعض رشتے بھی پیش کئے لیکن اس نے ان میں سے کسی کو قبول نہ کیا اس پر کسی نے طعنہ دیا کہ یہ تو کسی عرب شہزادی سے شادی کریگا چھٹو آمرانی ان کے اس طعنہ کا جواب دینے کے لئے حج کے بہانے مکہ شریف چلاگیا۔ اور وہاں فاطمہ نامی ایک نیک خاتون سے شادی کرکے واپس اپنے وطن آگیا۔ اس کے بھائی دلورائے کو یہ بھنک پڑگئی کہ فاطمہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ بدنیت انسان تھا لہٰذا ایک روز موقع پاکر اُس کے گھر میں گھس گیا۔ عین اس وقت چھٹو آمرانی بھی آپہنچا اور فاطمہ کی عزت بچ گئی۔ لیکن چھٹو آمرانی یہ منادی کرتے ہوئے اپنی بیوی کو ساتھ لیکر شہر سے نکل گیا کہ یہ شہر عنقریب تباہ

ہو جائے گا۔

دلّو رائے کے ظلم وستم کا خاتمہ کرنے کے لیے چھٹو آمرانی نے خلیفۂ بغداد کے دربار میں جاکر فریاد کی۔ جہاں سے سید علی مکیؒ کو ایک سو عربوں کے ساتھ سندھ میں بھیجا گیا۔ لیکن ان کے آنے سے پیشتر ہی بہمن آباد تباہ ہو چکا تھا۔ اس لیے سید علی لکی میں مقیم ہو گئے۔"

۲۔ جنب گذاریم جن سیں یہ کتاب جناب جی۔ ایم۔ سید کی تصنیف ہے۔ جس میں انہوں نے ان تمام بڑی بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات لکھے ہیں جن سے زندگی میں انہوں نے ملاقات کی۔ یا رابطہ قائم کیا۔ یا جن کے ساتھ مل کر سیاسی زندگی کے کچھ ایام گذارے ہیں۔ یہ دو حصوں میں ہے اور کافی ضخیم ہے۔ اسکی روایت کے مطابق سید صاحب کی آمد کا مختصر سا احوال مندرجہ ذیل ہے۔

"لکیاری سادات کا سلسلۂ نسب سید علی مکیؒ کے سندھ میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے جو مکہ سے ۵۲۰ھ یعنی ۱۱۲۷ء میں سندھ میں آئے تھے اور لکیؒ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔"

۳۔ قدیم سندھ یہ مرزا قلیچ بیگ کی تصنیف ہے۔ آپ کو شمس العلماً کہا جاتا ہے۔ اور یہ کتاب بھی خاصی معلومات کی حامل ہے۔ اگرچہ اتنی ضخیم نہیں ہے۔ مرزا صاحب اس میں لکھتے ہیں:۔

"سید علی مکی ۱۱۷ء میں محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے تھے اور لکیؒ میں آباد ہو گئے تھے۔"

۴۔ تذکرہ صوفیائے سندھ یہ کتاب محترم جناب اعجاز الحق قدوسی

صاحب کی بلند پایہ علمی و ادبی تصنیف ہے۔ وہ اسمیں لکھتے ہیں:۔

"چوتھی صدی ہجری میں حضرت شاہ صدر کے دادا حضرت سید علی مکیؒ جو اکابر شیوخ اور اولیائے کبار میں تھے۔ اپنے ایک سو رفقا اور ہمراہیوں کے ساتھ سامرہ (علاقہ عراق) سے ہجرت کرکے تبلیغ اور اشاعت اسلام کے لئے سندھ میں تشریف لائے اور پرگنہ سیوستان ضلع دادو میں بھگے ٹوڑھے نامی پہاڑ کے دامن میں دریا کے کنارے ایک پُر فضا اور خاموش بستی میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ گاؤں آئندہ چل کر حضرت سید علی مکیؒ کے نام پر لک علوی کے نام سے مشہور ہوا۔ اور ان کی اولاد لکیاری سادات کہلائی۔

سادات کا یہ پہلا خانوادہ تھا جو سندھ کے لئے باعثِ شرف و زینت بنا۔ لکیاری سادات کا خاندان اپنے شرف نجابت کے اعتبار سے تمام سندھ میں ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ لکیاری سادات کی شرافت۔ نجابت اور فضائل کا تذکرہ سندھ کے مورخین اور تذکرہ نگار نہایت اہتمام سے کرتے ہیں۔

ہمیں اس خاندان کے متعلق سندھ کی کسی تاریخ میں کوئی ایسا مواد نہیں ملتا جس سے اس خاندان کی آمد کے متعلق کچھ مزید معلومات حاصل ہوسکیں۔ حضرت سید علی مکیؒ کی اولاد" لکیاری سادات" سندھ کے ہر حصّہ میں موجود ہے۔"

ان روایات کا تاریخی تجزیہ

ان روایات کا تاریخی تجزیہ کرنے سے بہت سی باتیں سامنے

آتی ہیں۔ تحفتہ الکرام کی روایت کے مطابق سید علی مشہور اسلامی کمانڈر محمد بن قاسم کے ساتھ یا ان کے قریبی زمانہ میں سندھ میں آئے اور یہی بات مرزا قلیچ بیگ کی روایت سے ثابت ہوتی ہے مگر "فتح نامہ سندھ" اس سلسلہ میں خاموش ہے بالخصوص اس کے شارح محترم جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (موجودہ وائس چانسلر، صاحب سندھ یونیورسٹی) اور مرحوم مخدوم امیر احمد سابق پرنسپل اورینٹل کالج حیدرآباد نے اپنی قیمتی تحقیقات سے "فتح نامہ سندھ" (چچ نامہ) کی شرح لکھی اور نوٹ اور حوالے دیگر اس میں جو گرانقدر اضافہ کیا ہے اس میں سید علی کا تذکرہ کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ چھٹو آمرانی کی فریاد پر عراق سے سید علی کی سرکردگی میں ایک سو سپاہیوں کا سندھ میں آنا کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں۔ کیونکہ اس وقت سندھ میں بنو امیہ کے گورنر موجود تھے اور وہ دلورائے کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے ہر لحاظ سے طاقت ور اور صاحب اختیار تھے۔ اس لئے ان کی موجودگی میں عراق سے مددگار دستہ کا آنا محض روایت ہی ہو سکتا ہے اور اسے کسی صورت میں تاریخی حقیقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ چھٹو آمرانی کی قبر سیہون میں موجود ہے لیکن اس کے پس منظر کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ اگر سید علی حاکم عراق کے ایما پر سندھ میں آئے تھے تو اپنی مرضی سے سیہون میں آباد نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر بھی اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو آپ کے باقی ایک سو ساتھیوں کے متعلق کیا تصور کیا جائے جبکہ ان کی آبادکاری یا واپسی کا کوئی بھی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔

اگر جناب جی۔ ایم۔ سید کی روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا۔ کہ سید علی سندھ میں اس وقت وارد ہوئے جب بنو عباس کی حکومت بھی یہاں دم توڑ چکی تھی۔ اور پورا صوبہ طوائف الملوکی کی نذر ہو چکا

تھا. بنو عباس کی حکومت کا سندھ میں تقریباً ۲۵۵ھ میں خاتمہ ہو چکا تھا اس لئے یہ بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں زیادہ قرین قیاس روایت محترم جناب اعجاز الحق قدوسی صاحب کی ہے، جنہوں نے سید علی کا سندھ میں آنا بنو عباس کے زمانہ میں تسلیم کیا ہے اور یہی بات حضرت سید سکندر شاہ المعروف بہ سید شاہ مردان شاہ ثانی (موجودہ پیر پاگارو) نے روزنامہ جسارت کراچی (مورخہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۲ء) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی ہے۔ چنانچہ نمائندہ جسارت جناب ظہور احمد صاحب نے حضرت پیر پاگارو کے حالاتِ زندگی کے عنوان کے تحت لکھا ہے:۔

"پیر سید سکندر شاہ جو شاہ مردان شاہ ثانی کے لقب سے پیر پاگارو نمبر سات ہیں، پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی کے صاحبزادے ہیں جنہیں انگریزوں نے آزادی کی جدوجہد کے "جرم" میں ۲۰ر مارچ ۱۹۴۳ء کو حیدرآباد میں پھانسی دے دی تھی۔ اسی خاندان کے مورثِ اعلیٰ سید علی مکیؒ تھے جو عباسی دورِ حکومت میں سندھ میں آئے ان کی بیسویں پشت میں سید محمد بقا نام کے ایک بزرگ پیدا ہوئے۔ جن کے ایک فرزند سیدؒ محمد راشدؒ تھے۔"

آپ کی سندھ میں آمد کا مقصد

تحفۃ الکرام کی روایت کے سوا باقی تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ سیدؒ علی سندھ میں تبلیغِ اسلام کے لئے آئے تھے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زوال بنو عباس کے وقت سے پہلے ہی بے دینی کی تحریکوں نے سندھ میں اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے تو یہ بات اور بھی مصدقہ ہو جاتی ہے کہ سید علی کی سندھ میں آمد محض تبلیغ اسلام کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ بہت سے

بزرگ دور دراز علاقوں سے اس سرزمین میں احیائے اسلام کی خاطر وارد ہوئے تھے۔ ہم ذیل میں اسوقت کی سب سے زیادہ تباہ کن تحریک "قرامطہ" کا ذکر کرتے ہیں۔ تاکہ ہمارے بیان کی تصدیق ہو سکے۔

قرامطہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد شیعانِ علی دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو اسمٰعیلی کہلاتے ہیں۔ جو محمد بن اسمٰعیلؒ بن جعفر کو امام تسلیم کرتا ہے۔ اور دوسرا گروہ جعفر کے بیٹے موسیٰ کاظمؒ کو۔ یہ گروہ امامیہ اثنا عشریہ کہلاتا ہے۔ اسمٰعیلی کہتے ہیں کہ اسمٰعیل امام صاحب کی زندگی میں فوت نہیں ہوا تھا بلکہ دشمنوں کے خوف سے امام صاحب نے اسے چھپائے رکھا۔ اور اسکی موت کو مشتہر کر دیا تھا۔ لیکن امامیہ اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ اسمٰعیل فوت ہو چکا تھا اور امام صاحب نے اپنا جانشین موسیٰ کاظمؒ کو نامزد کیا تھا۔ یہ اسمٰعیلی بھی بعد میں دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے ایک تو خالص اسماعیلیہ کہلایا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ اسمٰعیل فوت نہیں ہوا۔ بلکہ غائب ہے اور وہ قائم منتظر ہے۔ اور کسی وقت بھی اس کا ظہور ہو گا۔ دوسرا فرقہ محمد بن اسمٰعیل کو امام تسلیم کرتا ہے اور اسمٰعیل کی موت کا قائل ہے۔ اس فرقہ کو مبارکیہ کہتے ہیں۔ مبارک نام کا ایک شخص اسمٰعیل کا مولےٰ تھا۔ فرقہ خطابیہ بھی اس سے ملحق ہو گیا۔ پھر یہ فرقہ بھی کئی فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان میں سے ایک قرامطہ ہے۔ جو قرمط نام کے ایک شخص سے منسوب ہے۔

قرامطہ کا زور عباسی خلیفہ المکتفی اور المقتدر (۲۸۹ھ تا ۳۲۵ھ) کے عہد میں بہت زیادہ رہا۔ اور اس کے بعد ان کی شورشیں زیادہ تر سندھ میں مرکوز ہو گئیں۔

قرامطہ کا مذہب دراصل اسلام نہ تھا۔ بلکہ یہ تو ایک سیاسی تحریک

تھی جس کا مقصد دنیائے اسلام کو مٹانا اور عربوں کی فوقیت اور برتری کو نیچا دکھانا تھا۔ اس تحریک کو چالاک عجمیوں اور ایرانیوں نے مذہبی جامہ پہنا دیا تھا۔ لوگوں کو نماز۔ روزے۔ حج۔ زکواۃ اور دیگر تکالیف شرعیہ سے آزادی دیکر بنایا جاتا تھا کہ یہ سب باتیں فضول ہیں۔ خدا کو ان کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ محمد حنیفیہؓ (جو حضرت علیؓ کے بیٹے تھے) کو خدا کا رسول منوایا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ کی عزت اس لئے کی جاتی تھی کہ علویوں کے طرفدار اور تمام شیعہ ان کے ہمدرد بن جائیں اور مخالفت کا اظہار نہ کریں۔ عام مسلمانوں کا قتل ثواب سمجھا جاتا تھا۔ قتل و غارت اور اپنے ہم مشربوں کے سوا دوسروں کو اذیت پہنچانا کوئی جرم نہ تھا۔ بلکہ عین ثواب خیال کیا جاتا تھا۔ حلال و حرام کی قید کو بھی اٹھا دیا گیا تھا۔ غرضیکہ اچھی خاصی لامذہبی اور عیاشی کا نام مذہب رکھدیا گیا تھا۔ چونکہ جاہل اور غارت گر لوگوں کے مزاج اور خواہشات سے اس مذہب کو خصوصی مناسبت تھی۔ لہٰذا ملک و قوم کے جاہل اور بد وضع لوگ اس مذہب کو بڑی آسانی سے اختیار کر لیتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فارس۔ خراساں۔ بحرین۔ مکران اور سندھ میں اس کا زور بڑھ گیا تھا۔

سندھ میں ملتان اور منصورہ کی دو آزاد مسلمان ریاستیں ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے سازشوں کا جال پھیلا کر ان دونوں کو آپس میں لڑوا کر تباہ کرا دیا۔ حتیٰ کہ ۳۸۳ھ میں منصورہ اور ملتان کی ریاستوں کی تباہی کے بعد سندھ میں مسلمانوں پر زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ چنانچہ ان تحریکوں کی یادگاریں آج تک مختلف رنگوں کے جھنڈوں کی صورت میں موجود ہیں۔ آپ سندھ میں آج بھی مختلف مکانوں۔ آستانوں۔ قبرستانوں اور درختوں پر سرخ۔ سفید۔ سیاہ۔ سبز اور مختلف سائز اور ڈیزائن کے جھنڈے دیکھ سکتے ہیں۔

ملتان کی ریاست کا مکمل خاتمہ محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا جو قرامطہ کا فتنہ

فرو کرنے کے لئے لشکر جرار لیکر نکلا۔ اور ملتان سے سومنات تک ان کے تمام اڈوں کو تباہ کرتا ہوا واپس غزنی چلا گیا۔ تاہم قرامطہ نے زیر زمین تحریک کی صورت میں کام شروع کر دیا۔ اور اپنے داعی اور نقیب دُور دُور دیہات میں پھیلا دیئے جو لوگوں کو بے دینی اور دہریت کی دعوت دیتے تھے اور انکار کرنے والوں کو کچلنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے زور کو توڑنے کے لئے محمد غوری نے بھی ملتان اور اوچ پر حملے کئے لیکن یہ فتنہ پھر زیر زمین چلا گیا۔

اس سلسلہ میں ہم شیخ محمد اکرام کی مایۂ ناز تصنیف "آب کوثر" کا ایک اقتباس بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"فتح سندھ و ملتان کے بعد مسلمانوں کی رفتار ترقی بہت سُست پڑ گئی اور ملتان سے دہلی پہنچنے میں انہیں کوئی پونے پانچسو سال لگے۔ یہی سُست رفتاری اشاعت مذہب میں بھی نظر آتی ہے۔ چونکہ سندھ اور ملتان میں قرامطہ کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس لئے وہاں جو تھوڑی بہت اشاعت اسلام ہو رہی تھی اس کا بھی رُخ بدل گیا۔ آج سندھ اور ملتان کی ابتدائی تاریخ پر تاریکی کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ اور جب تک اسمٰعیلی ماخذ سے اس زمانے کی ابتدائی تاریخ پر روشنی نہ پڑے۔ صحیح حالات کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ سندھ میں توسیع اسلام ابتدائی دور کا نہیں بلکہ بعد کا واقعہ ہے اور اگرچہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں روابط و تعلقات استوار ہونے کی وجہ سے زمین تیار ہو گئی تھی۔ بیشتر علاقے میں تخم ریزی بعد میں ہوئی۔

لاہور قرمطیوں کے دائرہ اثر سے باہر رہا۔ اس لئے اس شہر کی مذہبی تاریخ سے ہم بے خبر نہیں۔ اسے کئی قابل ذکر ہستیوں نے اپنے قیام سے شرف بخشا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فتح سندھ سے حضرت خواجہ اجمیری رح کی آمد تک

اشاعت اسلام کی رفتار اس سرزمین میں بڑی سست رہی۔ مگر اس کے بعد یکایک اس طرح مستعدی اور جوش وخروش کا ظہور ہوا کہ پچھلی سست رفتاری کی بہت جلد تلافی ہوگئی۔

مسلمان صوفیوں اور مبلغوں کے ملک کے دوسرے حصوں میں جانے کی ایک اہم وجہ۔ تاتاریوں کا حملہ تھا جس نے اسلامی دنیا کا نظامِ زندگی درہم برہم کر دیا تھا۔ اور جوق در جوق مسلمان علمآ اور مشائخ اسلامی ممالک سے جان بچاکر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ جیساکہ سر ایڈورڈ میکلیگن نے ضلع ملتان کے گزیٹیر میں بتایا ہے۔ اس زمانے کے تمام مشائخ کبار ان علاقوں سے آئے جہاں تاتاریوں نے ان کے لیئے زندگی دوبھر کر دی تھی اور اگرچہ منگولوں کے حملے سے باہر کے ممالک اسلامی کو بے انتہا نقصان پہنچا لیکن خطہ ہند و پاک کو فائدہ رہا اور ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلام کو بڑی رونق و ترقی ہوئی۔ اسلامی تاریخوں میں مغل سفاکیوں اور مظالم کا حال پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سمجھتے تھے۔ گویا یاجوج ماجوج آگئے ہیں۔ اور ہمیں اپنی مقدس چیزوں کو ان سے محفوظ کرنا ہے۔

ان حالات میں صوفیائے کرام نے سندھ میں احیائے اسلام کی خاطر مختلف علاقوں سے آکر رشد و ہدایات کے سلسلے جاری کئے اور لاکھوں گمراہوں کو پھر سے صراط مستقیم پر گامزن کر دیا۔ اسی سلسلہ میں سید علی بھی عرب سے تشریف لائے اور سیہون کے پاس ڈیرہ لگا دیا۔

لکھلوی یا لکّی

لک سندھی زبان میں دلکشا وادی کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان آباد اور خوشنما جگہ ہو حضرت سید علی نے ایسی ہی ایک جگہ کو اپنی اقامت کے لیئے پسند کیا جو سیہون کے پہاڑوں کے

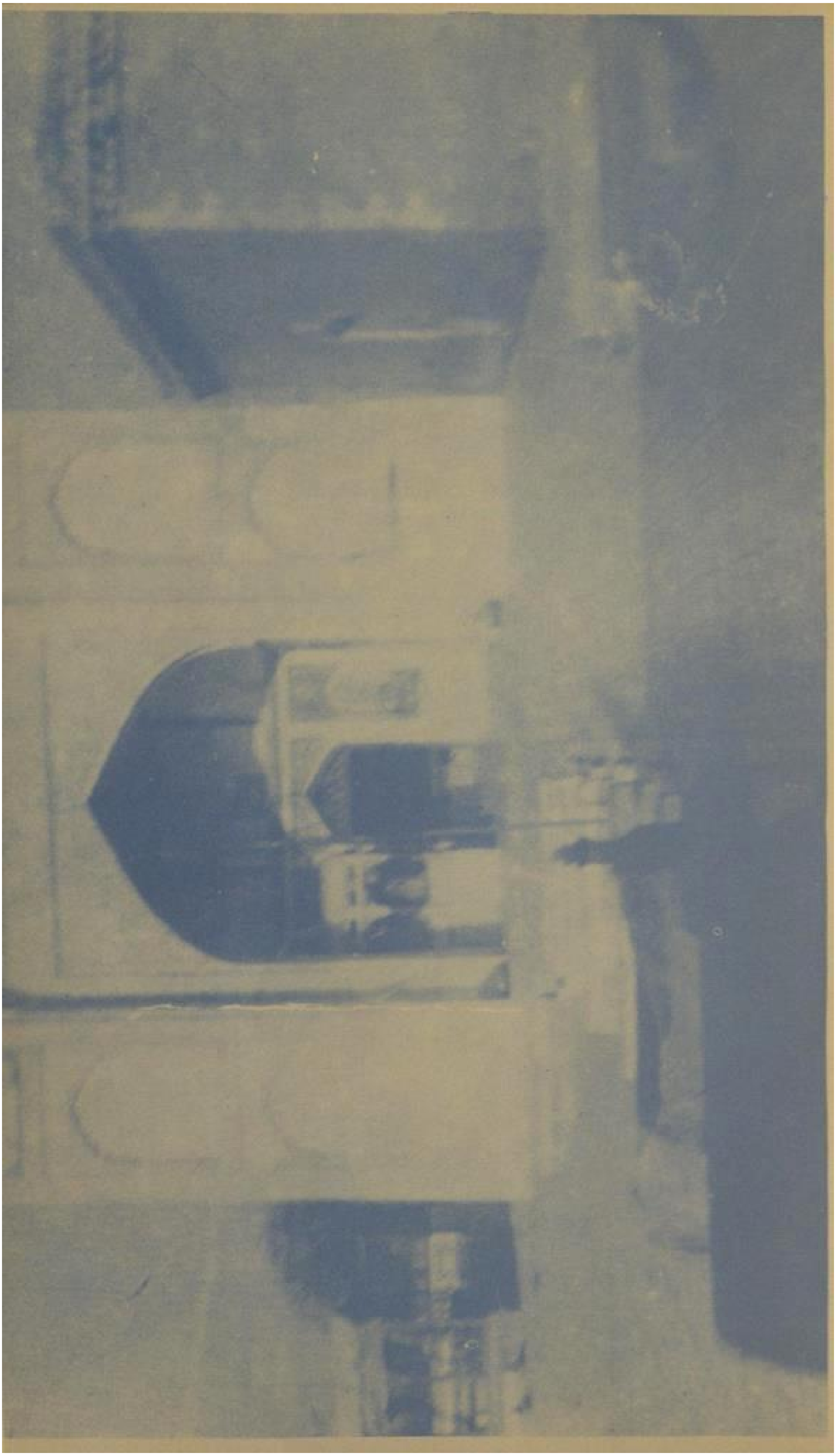

پاس ہے۔ اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں مقیم ہوگئے۔ آپ کے نام کی وجہ سے لوگوں میں یہ لک لکھلوی کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اور بعد میں استبداد زمانہ کے ہاتھوں یہ لفظ لکیاری بن گیا اور وہاں کے سادات لکیاری سادات کہلائے۔

سادات لکیاری میں سب سے زیادہ مشہور سید صدرالدین تھے جن کو شاہ صدر کہتے ہیں۔ ان کا قبہ لکی ریلوے اسٹیشن کے متصل ہے۔ وہ سید محمد کے بیٹے تھے جو بڑے صاحب کرامت تھے۔ ان کی اولاد سندھ میں بہت ہے۔ ان کے پوتوں میں سے ایک، سید محمد تھے۔ جو روزانہ اڑھائی ہزار بار درود شریف پڑھتے تھے ان کی تاریخ وفات کا مصرعہ بھی اس سے بنتا ہے ؎

درود خدا بر محمدؐ بود

ان کا بیٹا سید اوّل شاہ مجذوب تھا۔ یہ سب نیک اور شہرت یافتہ سادات تھے سید محمد شجاع شاہ صدر کے پوتوں میں سے تھے اور ان کا طریقۂ سلوک نقشبندی تھا۔ ان کے خاندان والوں سے دعا کرانے کے لئے شہزادہ معزالدین دہلی سے لکی آیا تھا۔

اس خاندان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ان کے فیوضات سارے سندھ میں مسلّم ہیں۔ اور آج بھی صدیاں گذر جانے کے باوجود ان کا مرکز سیہون ضلع دادو ہے۔ ان کے روحانی مراکز پورے سندھ میں قائم ہیں۔ لکی میں شاہ صدر کی درگاہ، پیر گوٹھ میں سید محمد راشد کی درگاہ اور پیر جھنڈو نزد نیو سعید آباد کی خانقاہ سے سب واقف ہیں۔ اس خاندان کے خلفاء کے اپنے اپنے روحانی مراکز سارے سندھ میں موجود ہیں۔ بالائی سندھ میں خلیفہ سوئی کی خانقاہ۔ خلیفہ دین پور کی خانقاہ۔ خلیفہ بھرچونڈی کی خانقاہ۔ اور خلیفہ امروٹ کی خانقاہ آج تک موجود ہیں۔ زیریں سندھ میں ان کے خلفا کی خانقاہیں قادری اور

نقشبندی سلسلوں کے انوار و تجلیات کا مرکز ہیں۔

حضرت سیّد محمدؐ لقا شہیدؒ

آپ سید امام شاہ کے ہاں ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں ہی دینی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور اس میں نام پیدا کیا۔ پھر باطنی تعلیم کی طرف رجوع ہوئے اور قادری سلسلے میں حضرت پیر سائیں عبدالقادر حسینی جیلانیؒ کی بیعت کی۔ ان کے یہ مرشد دیہہ سوڈھانی ضلع جھنگ صوبہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اب یہ جگہ چھنان شریف کی درگاہ کہلاتی ہے۔ آپ نے روحانی مراتب میں کمال حاصل کرنے کے لیے نقشبندی سلسلے میں بھی بیعت کی۔ اس سلسلہ میں آپ کے مرشد حضرت مخدوم محمد اسمٰعیلؒ تھے جو پریاں لوءِ میں رہتے تھے۔ یہ قصبہ ریاست خیرپور میں ہے۔ آپ نے تصوّف کی منزلیں اس سرعت اور خلوص سے طے کیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں خود اولیا اور عارفین کے مقتدا بن گئے۔ آپ کی ذات نقشبندی اور قادری سلسلوں کے کمالات کا حسین امتزاج تھی۔

جب تحصیل علم اور حصولِ کمالاتِ باطنیہ سے فارغ ہوئے تو خلق خدا کی خدمت کا آغاز کیا۔ چنانچہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ روحانی اسباق کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے تاکہ سالک ظاہر اور باطن میں کمال حاصل کرے۔

آپ کا اصلی گاؤں رسول پور شہر تھا جسے عرف عام میں "نندھی سائندی" کہتے ہیں۔ لیکن بعد میں وہاں سے ہجرت کر کے موضع رحیم ڈنہ کلہوڑ دیہہ فرید آباد میں آ گئے۔

آپ کو دینی کتابوں سے بہت محبت تھی۔ ان دنوں چونکہ چھاپہ خانے نہیں ہوتے تھے اور قلمی نسخے بہت نایاب اور گراں تھے۔ اس لئے اپنی کتابیں ہمیشہ اپنے پاس رکھتے

اور جب کبھی دوسری جگہ تبلیغ کے سلسلے میں تشریف لے جاتے تو کتابیں بھی ساتھ ہی رکھتے۔ ایک مرتبہ آپ خود ہی اپنی کتابوں کا ایک گٹھا سر پر رکھے سفر میں جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے آپ کو تاکا اور یہ سمجھکر کہ اس گٹھڑ میں ضرور دنیا کی دولت ہوگی آپ پر حملہ کر دیا اور ناحق شہید کر کے جب اس گٹھڑی کی تلاشی لی تو بجز کتابوں کے کچھ بھی نہ پایا۔ اس طرح ذلیل ہو کر چلے گئے۔ آپ کی شہادت کا یہ واقعہ ۱۱۹۸ھ میں پیش آیا۔ آپکی عمر شریف اس وقت ۶۳ سال کی تھی۔ آپ کا مزار شیخ طیب ریاست خیر پور میں ہے۔

آپ کے چار بیٹے سب سے زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔

۱۔ حضرت سید محمد راشد شاہ روضے دھنی رح

۲۔ حضرت سید عبدالرسول شاہ رح

۳۔ حضرت سید محمد سلیم شاہ رح

۴۔ حضرت علی مرتضیٰ شاہ رح (جو ایک نومسلم خاتون کے بطن سے تھے)

بعض روایات میں آپ کے دوسرے بیٹوں کا بھی ذکر آیا ہے اور آپ کے بیٹوں کی جملہ تعداد اٹھارہ بتائی گئی ہے۔

حضرت سیّد محمّد راشد شاہ رح (روضے دھنی)

آپ حضرت سید محمد بقا شہیدؒ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے جو یکم شعبان ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت گوٹھ رحیم ڈنہ کلہوڑہ میں ہوئی۔ جہاں اس وقت آپ کا سارا خاندان آباد تھا۔ اس گوٹھ کو اب پرانی درگاہ کہتے ہیں۔

حضرت پیر علی گوہر شاہ رح کے وقت میں اسی گوٹھ کو دریا کی طغیانی سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ نے وہاں سے نقل مکانی کر کے نئے گوٹھ میں اقامت

اختیار کرلی تھی جسے نئی درگاہ کہتے ہیں۔ اس کا تذکرہ ہم مناسب مقام پر کرینگے۔

آپ کا بچپن

حضرت سید محمد راشدؒ ابھی عالم طفلی میں ہی تھے کہ حضرت کے والدِ محترم حضرت سید محمد بقا شہیدؒ کے مرشدِ کامل حضرت مخدوم محمد اسمٰعیلؒ جو آپ کے سلسلۂ نقشبندیہ میں پیر طریقت تھے آپ کے گوٹھ میں تشریف لائے حضرت شہید نے آپ کو اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کر کے آپ کے لئے دعا کی درخواست کی حضرت مخدومؒ آپ کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور آپ کا نام پوچھا اور فرمایا "بہت اچھے ہونگے" (واضح رہے کہ راشد کا مطلب بھی بہت اچھا ہے) پھر آپ کو گود میں لیکر پیار کیا اور ارشاد فرمایا "یہ وہ مبارک روح ہے جس سے دنیا کا بہت بڑا حصہ فیضیاب ہوگا۔

اس ارشاد کے بعد بار بار آپ کے لئے دعا کی۔ اور مستقبل کے واقعات نے حضرت مخدوم کی دونوں پیشین گوئیاں درست ثابت کر دیں۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنی پیدائش کے بعد پہلے رمضان میں اپنی والدہ کا دودھ پینا چھوڑ دیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے روزے دھنی مشہور ہو گئے اور بعد میں جب آپ کے مزار مبارک پر گنبد کی تعمیر ہوئی اور روضہ بن گیا تو لوگ آپ کو روضے دھنی کہنے لگے۔

آپ بچپن میں ہی تنہائی پسند اور غور و فکر کے عادی تھے۔ لہو لعب سے آپ کو فطری طور پر کوئی لگاؤ نہ تھا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو اپنے والدِ محترم کے ارشاد پر نہایت خوش دلی سے حصول تعلیم میں منہمک ہو گئے۔

آپ فرماتے ہیں کہ بچپن میں ہمارے دل میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ ہم عارف کامل ہو جائیں اور صاحبِ ارشاد و تلقین ہو کر دوسروں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کریں۔ اور خود تجلیات و انوار کے کیف و سرور سے وجد کرتے رہیں۔ یہ خیال گویا الہامی کیفیت تھی اور قلب کی پاکیزگی کی آئینہ دار۔

آپکی تعلیم

آپ کی ابتدائی تعلیم حافظ زین رح کے پاس ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو حضرت مولانا فقیر اللہ نقشبندی (متوفی ۱۱۹۵ھ) کی خدمت میں شکارپور بھیجا گیا۔ اور آپ کچھ عرصہ تک اس مکتب کے خوشہ چیں رہے لیکن آپ کے والد محترم حضرت شہید رح جب دوسری بار آپ کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لئے وہاں آئے تو دیکھا کہ وہاں آپ کو پرتکلف کھانا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد عزت و تکریم کا سلوک بھی ہوتا ہے۔ یہ دیکھکر آپ نے ارشاد فرمایا" بیٹا جس مدرسہ میں پرتکلف کھانا موجود رہتا ہو وہاں تحصیل علم امر محال ہے (کیونکہ نفس پرور اور شکم سیر طالب حق عارف اور کامل ہونے کی بجائے غافل اور کاہل ہو جائے گا) اس لئے حضرت شہید رح آپ کو وہاں سے لے آئے اور کوٹڑی کبیر میں مخدوم میاں یار محمد رح کے پاس تحصیل علم کے لئے چھوڑ دیا جو عالم اور عارف تھے۔ یہاں کچھ عرصہ تک رہنے کے بعد ایک روز آپ کی طبیعت میں انقباض پیدا ہوا۔ اس لئے آپ نے شب کو ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر پانچ ہزار مرتبہ درود شریف پڑھکر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد اور استغاثہ کیا جس کے نتیجہ میں قبض کی کیفیت جاتی رہی اور بسط کا دروازہ کھل گیا۔ اور طبیعت میں نشاط و انبساط اور کیف و سرور کی لہریں دوڑنے لگیں۔

آپ نے آخر میں اپنے جملہ علوم دینیہ کی تکمیل مولانا محمد عارسیجوی کے پاس کی اس مدرسہ میں سید عاقل شاہ رح بھی آپ کے ہم مکتب تھے لیکن حضرت محمد راشد رح ان سے پہلے ہی دستار فضیلت حاصل کرکے مکتب سے روانہ ہوگئے تھے اور شاہ صاحب (سید عاقل شاہ) نے ایک سال بعد میں یہ رتبہ حاصل کیا۔

طریقت کی راہ

آپ فرماتے ہیں جب میں اور میرا بھائی علی مرتضیٰ کوٹڑی کبیر میں مخدوم یار محمد رح کے پاس ظاہری علوم کی تکمیل کے

سلسلہ میں مقیم تھے۔ ایک روز ہمارے والد محترم جناب سید محمد بقا رح وہاں تشریف لائے۔ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا۔" اے میرے بیٹو۔ مجھ سے حضرت مخدوم عبدالرحمٰن رح نے دریافت فرمایا کہ آپ نے اپنے بیٹوں کو طریقت کے کس سلسلہ میں بیعت کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی تک تو ایسا نہیں کیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ انہیں کسی نہ کسی سلسلہ میں ضرور بیعت کرلو۔ چنانچہ میں اس مقصد کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تمہیں بیعت کروں" اس کے بعد آپ نے ہم دونوں بھائیوں کو نقشبندی سلسلہ میں بیعت کیا۔ اور واپس گوٹھ روانہ ہوگئے۔

ہم دونوں دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ طریقت کی اس راہ پر بھی گامزن رہے۔ بھائی علی مرتضیٰ کو اس سلسلہ میں محویت ہونے لگی۔ لیکن میری طبیعت پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ جب دوسری دفعہ ہمارے والد محترم وہاں تشریف لائے اور ہماری باطنی کیفیت کے متعلق استفسار کیا تو میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خبر۔ اثر۔ یا کیفیت کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ سُنکر آپ نے مجھے قادری سلسلہ میں بیعت کیا تو میں نے ذکر جہر کی مشق شروع کردی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ کیفیت ہوگئی کہ ہر بُن مُو سے ذکر جاری ہوگیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں انوار وتجلیات کی بارش ہونے لگی۔ چنانچہ حضرت مولانا سید عاقل شاہ رح سے جو آپ کے ہم درس تھے۔ منقول ہے کہ میں ایک دفعہ کافی عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو ذکر کا اثر یہاں تک دیکھا کہ آپ کے قریب بیٹھنے سے حرارت محسوس ہوتی تھی۔

آپ کا حلقۂ ارادت

آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے حلقۂ ارادت لاڑ۔ سندھ۔ جیسلمیر۔ بلوچستان وغیرہ علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ گجرات۔ کاٹھیاواڑ اور رس کے پرے پرے تک آپ کے مرید موجود تھے۔ اور آپ کے ملفوظات اور خطوط کی بدولت لوگ آپ کے

ارشادات کو دُور دُور تک پہنچا دیتے تھے۔ درگاہ راشدیہ اس زمانہ میں سندھ میں سب سے بڑا مرکز عرفان تھا۔ جہاں سے ہزاروں پیاسی روحیں سیراب ہو کر شاداں وفرحاں واپس جاتی تھیں۔

وفات یکم شعبان ۱۲۳۳ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں آپ کا وصال ہو گیا اور آپ پرانی درگاہ شریف یعنی گوٹھ رحیم ڈنہ کلہوڑو میں مدفون ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد آپ کے پوتے حضرت سید علی گوہر شاہ رحؒ نے دریا کی طغیانی کے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے آپ کا تابوت وہاں سے نکال لیا اور ۶ ربیع الاول ۱۲۵۰ھ میں موجودہ نئی درگاہ میں دفن کیا۔

نئی درگاہ ریاست خیرپور میں کنگری نام کا ایک قصبہ ہے جس کو بادشاہ پور بھی کہتے ہیں۔ یہ پیر گوٹھ کے نام سے بھی موسوم ہے اسمیں سب سے پہلے پیر حزب اللہ شاہ رحؒ آکر آباد ہوئے تھے۔ یہ پیر پاگارو نمبر ۳ ہیں۔ ان کے آباد ہونے کے بعد یہ پیر گوٹھ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس گوٹھ میں دو بڑی مسجدیں اور قلعہ نما محلات بھی ہیں۔

ملفوظاتِ روضے دھنی رحؒ

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور صاحبِ علم وعمل اپنے مکتوب کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ حضرت سائیں روضے دھنی کے ملفوظات علم وعرفان اور شریعت وطریقت کا دریا ہیں۔ جس کی شناوری سے دین و دنیا کی سعادتوں کے موتی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم تبرّک طور پر حضرت سائیں رحؒ کے چند ملفوظات درج کرتے ہیں تاکہ آپ کے تبحر علمی۔ اخلاق فاضلہ اور باطنی کمالات کا اندازہ ہو سکے اور قارئین انہیں مشعلِ راہ بنا سکیں۔

تربیتِ اولاد

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت سائیں میرا بیٹا سخت بے ادب اور گستاخ ہے اور میری ڈاڑھی پکڑ کر مجھے مارتا ہے۔ آپ نے یہ سُنکر فرمایا۔ کیا تم نے اپنے لڑکے کو بچپن میں کبھی علم و ادب سکھایا تھا۔ اس نے عرض کی نہیں کیونکہ وہ سارا دن مویشی چراتا تھا۔ اس لئے کچھ بھی علم حاصل نہ کر سکا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر یہ بات ہے تو اب اس کی بے اَدبی اور گستاخی بالکل بجا ہے کیونکہ تم نے اسے بچپن میں علم و ادب سکھایا ہی نہیں ہے۔

(حدیث شریف میں ہے کہ باپ کا اپنے بیٹے کو بہترین تحفہ یہ ہے کہ اُسے اَدب سکھائے۔ کیونکہ اَدب کی ایک بات سکھانا صاع بھر کھجوروں کے صدقہ سے افضل ہے۔ مصنف)

مجازّیں کمال بے معنی ہے

خلیفہ میاں امید علی سے منقول ہے کہ ایک دفعہ ایک تھری آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ حضرت سائیں میں نے مجازیں کمال حاصل کر لیا ہے اب آپ توجہ فرمائیں۔ آپ یہ سُنکر جوش میں آ گئے۔ اور اسے دُرشتی سے فرمایا۔ تم نے یہ ہدایت کس سے حاصل کی؟۔ اس بات پر آپ کو سخت رنج ہوا تھا۔

(گویا مجازیں زندگی برباد کرنا محض رسوائی ہے)

سکرات میں ایمان کی سلامتی

ایک بار آپ نے فرمایا کہ جب حضرت احمد بن حنبل رح پر سکرات کا عالم طاری ہوا۔ تو غشی کی حالت میں آپ نے کئی دفعہ لا۔ لا (نہیں نہیں) کہا حاضرینِ مجلس متفکر ہوئے کہ اس سے مقصود کہیں توحید کی نفی نہ ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کو افاقہ ہوا اور غشی کی کیفیت جاتی رہی تو کسی نے پوچھا۔ حضرت آپ

بار بار لا کیوں کہہ رہے تھے ۔ تو انہوں نے جواب دیا ۔ کہ میں نے غشی کی حالت میں دیکھا کہ ابلیس سر پہ خاک ڈالے مُنہ نوچ رہا ہے ۔ کہ اے احمد تم آج ایمان سلامت لے جا رہے ہو ۔ اس کی یہ بات سُنکر میں برابر لا ۔ لا کہتا رہا ۔ جس سے میرا مقصد یہ تھا کہ ابھی نہیں ابھی نہیں کیونکہ ابھی تو سانس آ رہا ہے ۔ اور آخری سانس تک ایمان کے زائل ہونے کا اندیشہ بہر حال موجود ہے ۔

(گویا آخری سانس تک ایمان کی سلامتی کا خطرہ موجود رہتا ہے)

بُری صحبت سے پرہیز

خلیفہ امید علی سے منقول ہے کہ آپ نے ایک بار فرمایا ۔ ان چار شخصوں سے پرہیز لازمی ہے اور ان کی صحبت میں ہرگز نہ بیٹھنا چاہیئے ۱ ۔ مجذوب ۲ ۔ عورت ۳ ۔ بچہ ۴ ۔ مجہول ۔

عذابِ قبر سے نجات کی دعا

فرمایا امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہُ کا یہ دستور تھا کہ عذاب قبر سے پناہ کی دُعا بکثرت کیا کرتے تھے ۔ ایک بار کسی صحابی نے آپ سے پوچھا کہ امیر المومنین آپ یہ دُعا بکثرت کیوں مانگا کرتے ہیں تو ارشاد فرمایا کہ قیامت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل قبر ہے ۔ اگر یہ آسانی سے طے ہوگئی تو سب منزلیں آسان ہوجائینگی اگر اس میں تنگی ہوگئی تو سب منازل دشوار ہو جائینگی ۔

اولاد سے محبت

صاحبزادہ میاں حامد شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ بچپن میں میرے سب بھائی حضرت سائیں والد محترم کو پیر سائیں کہا کرتے تھے ۔ لیکن میں بابا (یعنی اَبّا) کہا کرتا تھا ۔ ایک دفعہ آپ حویلی میں تشریف فرما تھے ۔ میں نے دروازے کے باہر کھڑا ہو کر پکارا بابا ۔ بابا ۔ آپ نے میری آواز سُنکر دروازہ کھولا ۔ اس پر حاضرینِ مجلس نے کہا ۔ کہ بیٹا پیر سائیں کو بابا نہ کہو ۔ بلکہ

پیر سائیں کہا کرو۔ آپ نے یہ سُنکر فرمایا۔ کہ صاحبزادہ کو نہ روکو۔ میرے بیٹوں میں سے کسی نے بھی اس کے سوا مجھے بابا کہکر نہیں بلایا اور یہ لفظ سننے کو میری روح ترستی ہے

سنتؐ کی متابعت

سید مرتضٰی شاہ سے منقول ہے۔ کہ ایک دفعہ آپ اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ دریا کی طرف جا رہے تھے تاکہ مسجد کی چھت کے لئے سرکنڈے کٹوائے جائیں۔ آپنے ناقل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر فرمایا :" حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات اپنے صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر سفر کیا کرتے تھے۔ آؤ آج ہم بھی اس سنت کی متابعت کریں۔ یہ ارشاد کرنے کے بعد میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تقریباً آدھ کوس تک سفر کیا۔

آپکے خلفاؔ

آپ کے بہت سے خلفا تھے جنہوں نے مختلف مقامات پر رشد و ہدایت کی خانقاہیں قائم کیں۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ آپ کے چند خلفا مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خلیفہ محمد حسین ہمیسر ۲۔ خلیفہ اللہ رکھیو کلہوڑو بکھری تعلقہ کنڈیارو

۳۔ خلیفہ سوئی والے جن سے بھرچونڈی کے بزرگوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ اور ان سے امروٹ شریف کے بزرگوں نے اکتسابِ فیض کی سعادت پائی امروٹ شریف ہی کے بزرگوں کے احباب میں سے مولانا عبید اللہ سندھی۔ مولانا احمد علی لاہوری اور دیگر حضرات تھے۔ جنہوں نے رشد و ہدایت کے علاوہ تاریخ کے صفحات میں حیرت انگیز کارناموں کے باعث نئے باب کا اضافہ کیا۔

۴۔ خلیفہ سارنگ کلہوڑو تعلقہ ٹنڈو باگو ۵۔ خلیفہ آمری والا ٹنڈو باگو

۶۔ خلیفہ محمود کنڑیائی۔ ۷۔ خلیفہ محمد پناہ کیہر رتوڈیرو

۸۔ خلیفہ محمد لقمان کوری کوٹڑی ضلع دادو ۹۔ خلیفہ مابان والا تعلقہ ٹنڈو باگو

۱۰۔ خلیفہ نبی بخش لغاری مٹھی والے۔ ان سے یہ سلسلہ کچھ اور کاٹھیاواڑ میں پھیلا

۱۱۔ خلیفہ گل محمد ہالائی صاحب دیوانِ گل۔

آپ کی تصانیف

آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اسلئے رشد و ہدایت کی مصروفیتوں سے جب فارغ ہوتے۔ تو تصنیف و تالیف کا شغل اختیار فرماتے۔ آپ کی تصانیف میں شرح اسماء الحسنیٰ۔ جمع الجوامع اور آپ کے مکاتیب۔ آپ کے تبحر علمی۔ محققانہ ذوق اور روحانی مدارج کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کے ملفوظات کو آپ کے دو خلفا یعنی خلیفہ محمد حسین جہیر اور خلیفہ محمود نظامانی کنڑیہ والے نے الگ الگ جمع کیا ہے۔ یہ ملفوظات عرفان و تصوف۔ تاریخ و تمدن۔ اور علم و ادب کے بیش قیمت ذخیرے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

باب سوم

(سیّد صبغت اللہ شاہ اوّل کا مجاہدانہ دَور)

حُرّیت پسندی

آئندہ ابواب کی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ جذبۂ حریت کے متعلق کچھ تفصیل سے نہ لکھا جائے تاکہ حریت پسندی اور حریت پسندوں کی راہ میں آنے والی کٹھن منزلوں کو محسوس کیا جاسکے۔ ورنہ جانفروشی کی رنگین داستانوں سے قلب و روح صیقل نہ ہوسکیں گے اور فکر و نظر میں بالیدگی کی رمق تک پیدا نہ ہوگی۔ آئندہ ابواب میں اس خاندان کے ان جانبازوں کا تذکرہ ہوگا جنہوں نے قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی خاطر جانیں لڑا دیں اور حریت پسندی کی روح پھونک کر نا خواندہ قوم کے جسدِ بے جان میں زندگی کی لہر دوڑا دی جن کے ایک اشارہ ابرو پر سینکڑوں مردانِ حُر تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھ گئے اور کئی خاندانوں کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہوگئیں۔

ہم اس باب کا آغاز مولانا غلام رسول مہر کی مایۂ ناز تصنیف "سرگزشتِ مجاہدین" کے ایک طویل اقتباس سے کرتے ہیں تاکہ قارئین اس پیغام کو اپنے قلب و نظر میں جذب کرسکیں جو حُریت پسندی کا تقاضہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :-

"ہم جس عہد کو دورِ زوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ ناکامیوں اور مایوسیوں کی شبِ تاریک ہی نہ تھی۔ اس میں سربلندی اور ارجمندی کے لئے سرفروشی کی درخشاں کرنیں بھی جلوہ گر تھیں۔ جن کی ضیاگستری

عہدِ عروج کی شوکت آرائیوں کو بھی پیغامِ خجالت دے رہی تھی۔ افسوس ہے کہ جو آنکھیں تاریکی کی شدت میں بصیرت کی دولت ضائع کر چکی تھیں، وہ روشنی کی ان کرنوں سے بہرہ اندوز نہ ہو سکیں۔ ان میں بلند ترین درجہ سید احمد شہید رح کی تحریک کو حاصل ہے، جو خالص اسلامی بنیادوں پر اپنی نوعیت کی ایک ہی تحریک تھی۔ ضروری تھا کہ اس تحریک کی سرگذشت مرتب ہو جاتی۔ اس کے بغیر ہماری تاریخ مکمل نہ سمجھی جا سکتی تھی۔ عام تأثر یہ ہے کہ ہم نے حکم و فرمانروائی سے محرومی کے بعد اس سرزمین کی آزادی اور یہاں اسلامیت کی بحالی کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ برادرانِ وطن نے گذشتہ دس بیس سال میں جہادِ آزادی کے متعلق جو کتابیں مرتب کیں، ان میں عموماً غیر مسلم اکثریت ہی کی سرگرمیوں کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ مسلمان ایک مرتبہ پستی میں گرے تو پھر نہ اُٹھ سکے۔ حکمرانی کے ساتھ ہمت و غیرت کی متاع بھی کھو بیٹھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وسیع ملک کی آزادی کے لئے جو سرفروشانہ کارنامے مسلمانوں نے سرانجام دیئے ہیں، ان کی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی اور مسلمانوں کی قربانیوں کے مقابلے میں دوسری قوموں کی قربانیاں سمندر میں چند چلوؤں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسلامی قربانیوں کی سرگذشت معرضِ ترتیب میں بھی نہ آ سکی اور جہادِ وطن کا یہ پورا باب گم ہو کر رہ گیا۔

سید شہید رح کی تحریک کے سلسلہ میں دو پہلو اور بھی غور طلب تھے۔ اوّل یہ کہ مسلمانوں کی اس جماعت نے اسلامیت اور آزادی کے لئے جہاد

اسوقت شروع کیا جب یہاں اکثر گروہوں میں فی الجملہ افسردگی اور بے حسی طاری تھی۔ ان کے درمیان حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہنگامۂ مسابقت بپا تھا۔ یہاں تک کہ جہاد کی عزّت و حرمت کے اندازہ شناس بھی بہت کم لوگ تھے۔ اکثر اس کے نام سے ہی ہراساں تھے۔ دوم اس جماعت کا مقصد و مدّعا حصول آزادی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور وہ اس کے لئے کسی مادّی معاوضہ یا دنیوی منفعت کے کبھی طلبگار نہ ہوئے۔ وہ پورے سوا سو سال تک بے دھڑک اور بے دریغ اپنی جانیں اور مال اس راہ میں قربان کرتے رہے۔ اور ان کے دل ایک کلمۂ تحسین کی آرزو سے بھی کبھی مُلوّث نہ ہوئے۔ ان قربانیوں کے مقابلہ میں وہ اعمال و حرکات کیونکر لائے جا سکتے ہیں جن کے ساتھ اخبارو کے نفس پرور مقالے۔ گوناگوں مالی معاوضوں کے ہنگامے وابستہ تھے بے نفسی اور للٰہیت کی یہ داستان ان لوگوں کی بلند اسلامیت کا کرشمہ تھی۔ اور اس میں ہم سب کے لئے بصیرت و موعظت کا نہایت قیمتی سرمایہ موجود ہے۔

یہ مقدس بزرگ پاک و ہند کے ایک دورافتادہ گوشے میں اسلام اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کے خدّوخال سنوارتے رہے آج کون اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ ان کے دلوں میں کیسے کیسے ولولے موجزن تھے اور دماغوں میں کیا کیا انتظامی نقشے بسے ہوئے تھے جن کی زندگیوں کا ہر سانس ادائے فرض اور رضائے حق کے لئے وقف رہا۔ ان کی عظمتوں کا اندازہ ہم لوگ نہیں کر سکتے جو فرض اور رضا کے صحیح مفہوم سے بھی یکسر ناآشنا ہیں۔ وہ تو پیشِ نظر مقاصد کے لئے

جانفشانیوں کی شگفتگی میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔"

تحریکِ مجاہدین

تحریک مجاہدین ہندوستان کی وہ ناقابلِ فراموش تحریک ہے جس نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونک دی تھی۔ برصغیر پاک وہند کی آزادی میں عموماً اور پاکستان کی جدوجہد میں خصوصاً اس تحریک نے جو زندگی پیدا کی تھی وہ رہتی دنیا تک کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی اس تحریک میں ہر قوم اور ہر خطے کے مسلمانوں نے حصہ لیا۔ اور سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اس تحریک جہاد نے تقریباً ایک سو سال تک مجاہدوں کو آزادی کے لئے سرگرمِ پیکار کیا۔ انیسویں صدی عیسوی ساری اور بیسویں صدی کے پہلے تیس سال میں ان مجاہدوں کے اجتماعی اور انفرادی کارنامے درخشندہ ستاروں کی مانند تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ انگریزوں اور سکھوں نے بالاکوٹ کی تسخیر کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید مجاہدین کی تحریک اپنی موت آپ مرچکی ہے۔ مگر ۱۸۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک جن جانبازیوں کی داستانیں اس برصغیر کے کونے کونے میں گونجتی رہی تھیں۔ ان کی صدائے بازگشت پاکستان کی صورت میں رونما ہوئی۔

سرزمین سندھ میں تحریک مجاہدین کا ایک پودا حضرت سید احمد شہیدؒ نے بالاکوٹ جاتے ہوئے لگایا تھا۔ جس کی آبیاری حضرت سید صبغت اللہ شاہ اوّل المعروف بہ پیر سائیں پاگارو نے کی اور ان کے جاں نثاروں نے اسکی پرداخت اپنی زندگی کا مقصد سمجھکر کی۔ اور یہ سلسلہ تقریباً ایک صدی تک اس سرزمین میں بڑی آب وتاب سے جاری رہا۔ حتیٰ کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے پاک وہند کے معرکوں میں اسکی گونج نے سننے والوں پر دہشت طاری کر دی اور "بھیج پاگارو" کے فلک شگاف نعروں سے کافروں کے دل لرز اٹھے۔ ہم آئندہ ابواب میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالینگے۔

حضرت سیّد صبغت اللہ شاہ اوّل

المعروف بہ پیر پاگارو

آپ حضرت سیّد محمد راشدؒ کے منظور نظر فرزند تھے۔ جنہیں حضرت نے اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ کیونکہ آپ اپنے باقی بھائیوں سے زیادہ عالم۔ عامل عارف اور کامل تھے۔ اور سجادگی کے لئے آپ سے بڑھکر دوسرا کوئی موزوں نہ تھا۔ آپ کی سندھ میں مقبولیت اور علمی اور روحانی مراتب اور اہمیت کا اندازہ سید حمید الدین کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انہوں نے آپ کے متعلق لکھا ہے۔

"تذکرہ صوفیائے سندھ" میں اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں :۔

"باشندگانِ سندھ کے نزدیک سارے ملک میں اُن (پیر صبغت اللہ) جیسا کوئی شیخ و مرشد نہیں۔ تقریباً تین لاکھ بلوچ ان کے مرید ہیں مرجعِ خلق عام ہیں۔ جاہ و جلال سے زندگی گذار رہے ہیں۔ جود و کرم اور اخلاص و مروت میں بھی شہرۂ آفاق ہیں۔ ان کا کتب خانہ بڑا عجیب و غریب کتب خانہ ہے۔ بادشاہوں اور امراء کے پاس بھی ایسا کتب خانہ نہ ہوگا۔ پندرہ ہزار معتبر کتابیں اس میں موجود ہیں۔"

آپ کی سجادگی اور ملکی حالت

محترم جناب مولانا اعجاز الحق قدوسی اپنی مایۂ ناز تصنیف "تذکرہ صوفیائے سندھ" میں لکھتے ہیں :۔

"سید صبغت اللہ اوّل نے جب مسندِ رشد و ہدایت کو زینت بخشی اس

وقت سلطنتِ اسلامیہ کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ پنجاب پر سکھ چھائے ہوئے تھے۔ اور سندھ کے حصول پر انگریزوں اور سکھوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ حالات کی ناسازگاری نے مسلمانوں کو اس درجہ بدحواس وحشت زدہ۔ اور کم ہمت بنا دیا تھا کہ ان کے قوائے عمل شل ہو چکے تھے سارے معاشرے پر انحطاط کا رنگ غالب تھا۔ مذہب کی روح مفقود ہو چکی تھی۔ اوہام اور رسوم پرستی کو مذہب کا نام دیا جاتا تھا۔ اس تنزل اور انحطاط کے زمانہ میں شاہ صبغت اللہ اول نے اعلائے کلمۃ الحق۔ تبلیغ و اصلاح اور تربیت کا کام شروع کیا۔ اس مردِ حق آگاہ نے جب یہ دیکھا۔ کہ سکھ حکومتِ سندھ کی جانب پھیلنے لگے ہیں تو آپ نے جہاد کا عزم مصمم کر لیا۔ آپ کا کوئی وعظ جہاد کی ترغیب اور فضائل سے خالی نہ ہوتا تھا۔ کچھ اور لاڑ کے مرید جوان مواعظ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آپ نے ان کو مختلف خطوط لکھ کر جہاد کی اہمیت ان پر واضح کر دی۔ اور انہیں جہاد کے لئے دعوت نامے لکھے۔

سندھ کی سیاسی حالت کا تفصیلی جائزہ

آپ کی سجادگی آپ کے والدِ بزرگوار کے انتقال کے بعد شعبان ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں ہوئی جب کہ سندھ پر میروں کی حکومت تھی۔ انگریزوں نے سندھ میں کلہوڑہ حکمرانوں کے زمانے میں قدم رکھا تھا جن کا عہدِ حکومت مغلوں کے زوال یعنی ۱۷۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۷۸۳ء تک رہا۔ جس کے بعد تالپور میروں کی حکومت کا آغاز ہوا اور ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔

انگریز کلہوڑوں کے زمانہ میں تاجر کی حیثیت سے سندھ میں داخل ہوئے

اور ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ دونوں ایک دوسرے کی حدود سلطنت میں جارحانہ اقدام نہ کریں گے۔ جب کلہوڑوں کے بعد حکومت میروں کے قبضہ میں آئی تو انگریزوں نے ۱۸۰۹ء میں ایک معاہدہ کیا جو میرانِ سندھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان طے پایا تھا جسکی رو سے سندھ اور برطانوی حکومت میں رفاقت قائم کر کے۔ دونوں کے درمیان امن بحال رکھنے اور سفارت برقرار رکھنے پر اتفاق کیا گیا تھا۔

ادھر پنجاب میں رنجیت سنگھ نے سکھوں کے مختلف جتھوں کو متحد کر کے بڑی طاقت حاصل کر لی تھی اور سارے پنجاب کا بلا شرکت غیرے حاکم بن بیٹھا تھا۔ اس کی قوت کے پیش نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کے گورنر جنرل لارڈ منٹو نے اس کے ساتھ اتحاد کر لینا ضروری سمجھا تاکہ سکھوں کی یورش حدود پنجاب سے آگے نہ بڑھنے پائے چنانچہ ادھر میرانِ سندھ سے ۱۸۰۹ء میں معاہدہ کیا گیا اور اُدھر پنجاب میں رنجیت سنگھ سے امرتسر کے مقام پر باہمی دوستی اور اتحاد کا معاہدہ بھی اسی سال ۱۸۰۹ء میں کر لیا۔

۱۸۳۰ء تک انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ تالپور میروں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ اس سے قبل ان کا ارادہ تسخیر سندھ کا نہ تھا۔ لیکن ۱۸۲۸ء میں جب ڈاکٹر الیگزینڈر خیرپور کے پرنس علی مُراد کے علاج کے لئے بمبئی سے آیا تو اس نے نیا گل کھلایا۔ وہ بہت قابل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اہل قلم اور جاسوس بھی تھا۔ اس نے نہ صرف پرنس علی مُراد کا علاج ہی کیا بلکہ سندھ کی طبعی اور سیاسی حالت کے نقشے اور رپورٹیں تیار کر کے خفیہ طور پر انگریزوں کو بھجوائیں تاکہ انہیں حملہ کرنے میں معاون ثابت ہوسکیں۔ اس نے نہایت عیاری اور ہوشیاری سے تالپور میروں کے نظامِ حکومت کا جائزہ لیا اور تمام معلومات انگریزی حکومت کو فراہم کیں منا ہے اس نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ :۔

" سندھ کے غریب عوام تالپور اور بلوچ سرداروں کی بیگار میں کام

آتے ہیں۔ ہندو اکثر پنجابی ہیں اور باطنی طور پر تالپور میروں کے خلاف ہیں۔ جب بھی کوئی بیرونی طاقت سندھ پر حملہ آور ہوگی تو صرف یہاں کے بلوچ سردار ہی اس کا مقابلہ کریں گے۔ کیونکہ عوام ان تالپور سرداروں سے سخت بیزار ہیں اور ان سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے سندھ کے تالپور حکمرانوں سے ایک اور معاہدہ کیا جس میں طے کیا گیا کہ انگریزوں کو دریائے سندھ میں جہاز رانی کی پوری آزادی ہوگی اور اس دریا کے راستے فوجی نقل و حمل نہ ہوگی۔ پھر ۱۸۳۴ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس کی رُو سے طے پایا کہ سندھ کے تالپور حکمران انگریزوں کے مال پر برائے نام محصول لیں گے۔"

اِدھر یہ معاہدے عمل میں آگئے اور اُدھر انگریزوں نے سکھوں کو اہلِ سندھ کے خلاف تشدد پر اُکسایا۔ پھر جب حالات نازک صورت اختیار کر گئے اور سندھ کو سکھوں کی خوفناک یلغار کا خطرہ ہوگیا تو پنجاب کی سکھ حکومت اور سندھ کے میروں کے درمیان ثالثی کے لئے خود میدان میں آگئے اور نہایت عیاری سے سندھ کے میروں کو سکھوں کے متوقع حملے کے بھیانک نتائج اور عواقب سے خوف زدہ کرتے رہے۔ اور میروں نے وحشت زدہ ہوکر انگریزوں سے ایک معاہدہ کرلیا جس کی رُو سے یہ طے پایا کہ تالپور سردار اپنے دربار میں انگریز ریذیڈنٹ رکھیں گے جو سیاسی معاملات میں ان کی رہنمائی کرے گا۔ اور انگریزوں کی سپاہ کو سندھ میں قیام کی اجازت دی جائیگی۔ اور تالپور سردار ہی اس سپاہ کے تمام اخراجات برداشت کریں گے۔ یہ معاہدہ ۱۸۳۶ء میں طے پایا تھا۔ اور یہی سندھ میں انگریزوں کی بالادستی کا پہلا اور مضبوط ذریعہ بن گیا۔

سندھ پر انگریزوں کا قبضہ

پنجاب کی سکھ حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ سندھ کے حلیفانہ اور دوستانہ تعلقات کا خاتمہ ۱۸۴۳ء میں اس وقت ہوا جب سر چارلس نیپیئر نے سندھ کو باقاعدہ فتح کر کے اسے انگریزی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس سلسلہ میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے :-

" سندھ کی مثال سب سے درد ناک ہے وہاں کے امیر ایک طرف انگریزوں سے بدکتے تھے دوسری طرف انہیں سکھوں کی پیشقدمی کا خطرہ تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے کام لیا وہ سکھوں کی پیش قدمی کے خطرے کو سب سے بھیانک صورت میں پیش کر کے امیرانِ سندھ پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جماتے رہے۔ رنجیت سنگھ میں اتنی وسعت قلبی نہ تھی کہ وہ امیرانِ سندھ کو پورا اطمینان دلا کر انگریزی اثرات کو دور رکھتا۔ اور نہ ہی امیروں میں اتنی ہوشمندی تھی کہ وہ سکھوں کے خطرے کی روک تھام کے لئے کسی دوسری تدبیر سے کام لیتے۔ اور انگریزوں سے بچے رہتے۔ جو تقریباً ایک سو سال میں بیسیوں دیسی ریاستوں کو ہضم کر چکے تھے۔

امیروں سے حتمی معاہدہ تھا کہ فوج ان کے علاقہ میں سے نہ گذاری جائیگی۔ لیکن پہلی افغان جنگ میں انگریزوں نے اس شرط کی خلاف درزی کی۔ بلکہ فوج گذارنے کے علاوہ امیروں کو مجبور کیا کہ وہ شاہ شجاع کو روپیہ دیں۔ افغان جنگ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے میروں کو دبانا شروع کر دیا کہ تم نے ہماری مشکلات کے وقت دوستی کو فراموش کر دیا تھا۔ اب نیا معاہدہ کرو۔ یہ نیا معاہدہ امیروں کے استقلال کو

ختم کرنا تھا۔ جب وہ بیچارے تذبذب میں پڑے تو فی الفور حملہ کر دیا۔"

خود ایک انگریز ولیم ہووٹ لکھتا ہے :-

" جو رئیس اور حکمراں انگریزوں کی دوستی کے جادو سے مسحور ہوئے ان کے لئے یہ دوستی انجام کار مہلک ثابت ہوئی۔ کیونکہ اگر ان لوگوں نے غاصب انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات گوارہ نہ کئے تو ان پر ارادہ ہائے بد کا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور ان کے علاقے مسخر کر لئے گئے۔ اگر انہوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی تو وہ ڈپلومیسی کے جال میں اسطرح اُلجھ گئے کہ اپنی عزت اور موروثی مقبوضات سے محروم ہوئے بغیر نجات نہ پا سکے۔"

میجر اوٹرم کو جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے سندھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا اور اسے حکم دیا گیا کہ سندھ پر قبضہ کر کے میروں کو قرار واقعی سزا دے تو سندھ میں آکر اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کا ارادہ بدل دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

" سندھ کے باشندوں میں سے سوائے ہندوؤں کے کوئی بھی حکومت میں تبدیلی کو کسی وقت اور کسی طور پر بھی پسند نہ کرے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو بھی مارا جائے گا وہ قتل ہوگا۔ لہٰذا اس کام کے لئے موزوں ترین شخص چارلس نپیئر ہے۔"

انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس لئے افغانستان کی جنگ میں شکست کی ذمہ داری میروں پر ڈالدی گئی۔ اور ان الزامات کی تحقیق کے بہانے سے چارلس نیپئر کو سندھ پر قبضہ کرنے کے لئے نامزد کر دیا گیا۔ وہ ولایت سے تازہ تازہ آیا تھا اور ہندوستان کی ہر زبان سے نابلد تھا اور بہت سخت مزاج فوجی

تھا۔ اور بدقسمتی سے علی مراد خاں اپنے بھائی کی بجائے خود ریاست خیرپور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ کمزوری نیپئر کے لئے کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔ اس نے میروں کو اسقدر پریشان کیا کہ وہ تنگ آکر لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ نیپئر نے زبردست حملوں سے شکست پر شکست دیکر میروں کی کمر توڑ دی۔ اور اگست ۱۸۴۳ء میں پورے سندھ پر قابض ہو گیا۔ اس کی کامیابی کے صلے میں اسے سندھ کا پہلا انگریز گورنر مقرر کر دیا گیا۔ اور میر علی مراد کے والد میر سہراب خاں کو ریاست خیرپور کا علاقہ بطور عطیہ دے دیا۔

مسلمانوں کی زبوں حالی

مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی مسلمانوں پر سراسیمگی، وحشت، انتشار اور تنزل کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ جو رفتہ رفتہ زیادہ گہرے ہوتے گئے۔ مرہٹوں کی چیرہ دستیاں، سکھوں کا عروج اور انگریزوں کی فریب کاریاں مسلمانوں کے لئے غلامی نکبت۔ ادبار اور رسوائی کا پیغام لائیں۔ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ شاہی مسجد لاہور کو اصطبل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یوپی میں انگریزوں نے مسلمانوں کو افرادی۔ اقتصادی اور معاشرتی طور پر کچل کر رکھدیا تھا۔ سندھ پر سکھوں اور انگریزوں دونوں کی حریص نگاہیں بار بار اٹھتی تھیں اور ایک دوسرے کو دھوکا دیکر اس پر قبضہ کرنے کی تگ و دو میں دونوں ہی محو تھے۔ صوبہ سرحد میں سکھوں نے خواتین کو بدحواس کر رکھا تھا۔ اور مسلمانوں پر بالعموم یاس و قنوطیت اور جمود طاری ہو چکا تھا۔

حریت پسندوں کی جانبازیاں

ان حالات میں مختلف علاقوں میں اہل دل مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہانے کی بجائے ان کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کھینے کے لئے میدان عمل میں

آنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا خانوادہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مضطرب لیکن محرک تھا۔ ان کے تربیت یافتہ عزیزوں اور شاگردوں نے انگریزوں اور سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تاکہ مسلمانوں کی آزادی کے بجھے ہوئے چراغ پھر سے جل اٹھیں۔ حصول آزادی کی اس تحریک کو جسے تحریک مجاہدین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے بعد میں انگریزوں نے بدنام کرنے کے لئے وہابی تحریک کا لقب دیکر اپنی دانست میں خوب بدنام کیا حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت سید اسمٰعیل شہیدؒ جیسے مجاہد، مومن اور مخلص رہنماؤں کی قیادت نصیب ہوئی۔ جنہوں نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں جہاد کی چنگاری کو روشن کیا۔ اور ان کے شعور کو بیدار کرنے میں بھرپور بلکہ بے مثال جد وجہد کی۔ یہ گویا حکومت الٰہیہ کے قیام کا نقطۂ آغاز تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ

تحریک مجاہدین کے روحانی اور عسکری قائد حضرت سید احمد شہیدؒ خاندان ولی اللہی کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ ۸ صفر ۱۲۰۱ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو پیر کے دن رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور شاہ عبدالقادر سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ۱۲۲۲ھ میں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں آپ نے انگریزوں اور سکھوں سے جہاد کے لئے مسلمانوں کو منظم کیا تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام کی راہ ہموار کی جائے اور ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء میں جمعہ کے دن بالاکوٹ ضلع ہزارہ میں سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی۔

اگرچہ آپ حکومت الٰہیہ قائم نہ کر سکے لیکن مسلمانوں کے سامنے فکر وعمل کی ایسی راہ متعین کر گئے جس پر چلکر بالآخر مسلمانان ہند نے ۱۹۴۷ء میں حکومت

اسلامیہ پاکستان کی نعمت حاصل کر لی۔

سندھ میں حریت پسندی کی تحریک

جس زمانہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ ہندوستان میں تحریک مجاہدین کی تنظیم کر رہے تھے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں سرزمین سندھ کے جلیل القدر روحانی پیشوا حضرت سید صبغت اللہ شاہ صاحب اول بھی ان ہی خطوط پر اپنی فکری و نظری تحریک کا آغاز کر رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا نقطۂ نظر ایک ہی تھا۔ دونوں یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان سے سکھوں اور انگریزوں کا اقتدار ختم کر کے حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ مظلوم انسانیت سکھ کا سانس لے سکے اور مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکیں۔ حضرت سید صبغت اللہ شاہ نے اپنے جان نثار مریدوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ عسکری تربیت کا بھی بندوبست شروع کر دیا تھا تاکہ یہ سرفروش اور جانباز مجاہد صرف ذکر و فکر کے عامل ہی نہ رہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر ملت اسلامیہ کی سربلندی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا سکیں اور ہر طاغوتی طاقت سے ٹکر لے کر اسے نابود کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

قران السعدین

ان دونوں کی باہمی ملاقات امت مسلمہ کے لئے ایک بابرکت لائحہ عمل طے کرنے کا بنیادی نقطہ ثابت ہوئی حضرت سید احمد شہیدؒ جب اپنے مجاہدین کے ساتھ صوبہ سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو راجستھان کی راہ سے سندھ میں داخل ہوئے، کیونکہ یہ راستہ نسبتاً محفوظ تھا۔ اور انہیں حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول کے افکار و نظریات کی اطلاع پہلے سے ہی مل چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے حضرت سید سے ملاقات کی خاطر رانی پور کا ارادہ کیا تاکہ وہاں سے پیر گوٹھ جا سکیں۔ حسنِ اتفاق دیکھئے عین انہی دنوں

حضرت سید صبغت اللہ شاہ بھی اپنے ایک سو مریدوں کے ساتھ رانی پور میں آئے ہوئے تھے۔ یہیں ان دونوں بزرگوں کی پہلی ملاقات ہوئی اور ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھکر خوشی کے باغ و بہار کھل گئے چونکہ وہاں رازدارانہ گفتگو کا موقع محل نہ تھا اس لئے حضرت سید صبغت اللہ شاہ نے آپ کو پیر گوٹھ چلنے کی دعوت دی جسے حضرت سید احمد شہید رح نے بخوشی قبول کرلیا۔ چونکہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ کو وہاں کسی کام سے مزید ایک دو روز ٹھہرنا ضروری تھا اس لئے آپ نے حضرت شہید رح کو اپنے بھائی کے ساتھ پیر گوٹھ بھیج دیا۔ جہاں حضرت شہید اپنے مجاہدین کے ساتھ پہنچ گئے۔

۱۷ ذی قعدہ ۱۲۴۱ھ کو حضرت سید اپنے غازیوں کے ساتھ پیر گوٹھ پہنچے وہاں سید صبغت اللہ شاہ کے مریدوں اور آپ کے بھائیوں نے مہمان نوازی اور خاطر و مدارات میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ دوسرے دن حضرت سید صبغت اللہ شاہ بھی وہاں تشریف لے آئے اور انہوں نے حضرت شہید رح اور ان کے غازیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔ تیسرے دن حضرت شہید رح نے نہایت اصرار کرکے اس تکلف سے روکا اور مجاہدین میں رسد تقسیم ہونے لگی۔ حضرت شہید رح پیر گوٹھ میں تقریباً تیرہ دن قیام فرما رہے اور اس کے بعد وہاں سے شکارپور کی راہ لی تاکہ بلوچستان اور افغانستان کی حدود کے ساتھ ساتھ پشاور تک پہنچ سکیں۔

تحریک آزادی کیلئے لائحہ عمل اور مختلف غلط فہمیاں

اس سلسلے میں ہم اصلی صورت حال پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان غلط فہمیوں سے اپنے قارئین کو واقف کرائیں جو اغیار نے پھیلائیں اور جنہیں انہوں نے بلاتحقیق قبول کرکے ان کی اس قدر تشہیر کی کہ صداقت اور حقیقت کا روشن چہرہ ان کے پس منظر میں چھپ گیا۔ سب سے پہلے ہم "لب تاریخ سندھ" کے مصنف

خداداد خان کی تحریر پیش کرتے ہیں :-

"یہ فرقہ (یعنی حُر) اکثر درگاہ کنگری کے مرید اور پیرو ہیں۔ اور صداقت کی راہ سے بھٹکنے والے ان گمراہوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اپنے پیر (سجادہ نشین) کو نعوذ باللہ خدا سمجھتے ہیں اور الصمد لم یلد ولم یولد کی صفات سے متصف جانتے ہیں اور اسی وجہ سے اس (سجادہ نشین) کے بے مثل ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ گمراہ لوگ حُر کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان حُروں کا قصہ بہت طویل ہے۔ لیکن مختصراً بات یہ ہے کہ حُر (جو عربی بلکہ ترکی کا لفظ ہے) سے مُراد دراصل وہ پہلوان صادق" ہے جو کربلا کے میدان میں حضرت حسین رض کی طرف سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا تھا (یعنی حضرت حُر رض لیکن چونکہ یہ فرقہ بدکاری میں مشہور ہے۔ اس لئے انکو لُر کہتے ہیں جس کا مطلب سندھی لغت میں بے ... ل اور بدکار ہوتا ہے"

"قدیم سندھ" کے مصنف مرزا قلیچ بیگ نے لکھا ہے :-

"پیر محمد راشد کی وفات کے وقت دستار خلافت پر جھگڑا ہوا لیکن انہوں نے اپنے لئے صبغت اللہ کو وارث بنایا۔ جنہوں نے دریائے نارہ (مہران اصغر) کے اس پاس بہت سے مرید کئے۔ دوسرے بھائیوں نے ان کو (پیر صاحب کو) مارنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے مریدوں نے باہم اتفاق کرکے یہ طے کر لیا کہ اپنے پیر صاحب کے علاوہ ان کے کسی رشتہ دار یا بھائی کی یعنی کسی کی بھی فرمانبرداری نہیں کریں گے اس نمک حلالی اور جاں نثاری کی وجہ سے پیر صبغت اللہ نے ان کو حُر کا نام دیا۔ یہ مناسبت اس حضرت حُر رض سے تھی جنہوں نے حضرت امام حسین رض کی خاطر کربلا میں سر قربان کیا تھا۔ لیکن دوسرے مسلمان

ان کو نفرت سے لڑ کہتے ہیں جس کا مطلب پلید یا ناپاک ہے"۔

ان دونوں کی حقیقت اور اس ڈھول کا پول کھولنے کے لئے محترم جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب موجودہ وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کی اس تشریح کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو انہوں نے "لُبِ تاریخ سندھ" کے صفحہ ۲۵۵ پر فٹ نوٹ کی حیثیت سے فارسی زبان میں لکھے ہیں اور ہمارے خیال میں اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے :۔

"یہ گمان (بے مثل سمجھنے کا) سراسر خلاف حقیقت ہے۔ سرکار برطانیہ کے اہل کاروں نے یہ الزامات عمداً لگائے ہیں اور اسکی تشہیر میں انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ تاکہ مسلمانانِ سندھ عموماً اور اہلِ سندھ خصوصاً حُروں کی جماعت سے (جو حُریت پسند اور سرکار برطانیہ کی دشمن ہے) بدظن ہو جائیں اور انہیں کوئی مدد و معاونت نہ مل سکے

مولف نے جو کچھ لکھا ہے وہ سرکار برطانیہ کی وفاداری اور نمک خواری کی وجہ سے لکھا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سرکار برطانیہ کا خدمتگار رہا ہے (واضح ہو کہ اسے خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا) لیکن حُر برطانوی استعمار کو حقارت سے دیکھتے اور ہمیشہ اس سے نبرد آزما رہتے تھے۔

حُروں کا آغاز سندھ میں اسطرح ہوا کہ اٹھارویں صدی میلادی میں جب مغلوں کی حکومت کو زوال آیا۔ اور مسلمانوں کی قوت کا شیرازہ بکھر گیا۔ تو غیر مسلموں میں سے مہاراشٹر کے مرہٹے اور پنجاب کے سکھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی اپنی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انیسویں صدی میلادی میں سکھوں نے سارے پنجاب

پر قبضہ کر لیا اور شمال مغربی علاقوں پر لشکر کشی شروع کر دی حتیٰ کہ پشاور کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اور اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پختون اور افغان قبائل جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنی بہادری کی وجہ سے ضرب المثل تھے۔ ان سے مغلوب ہو جائیں

یہ صورتِ حالات دیکھکر مجاہد اعظم حضرت سیّد احمد شہیدؒ کو جوش آیا۔ اور انہوں نے غیرت دینی و حمیتِ ملّی کے جذبہ سے سرشار ہو کر سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ اور اپنے رفقا اور غازیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف عزم سفر کیا۔ چونکہ اسوقت پنجاب سکھوں کے قبضہ میں تھا۔ اس لئے سید شہیدؒ راجپوتانہ کی راہ سے سندھ میں وارد ہوئے۔ حیدر آباد شہر میں تالپور حکمرانوں نے ان کی خاطر مدارات کی اور ان کے شایان شان مہمان نوازی کا ثبوت دیا لیکن سکھوں کے خلاف جہاد میں معاونت کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ مبادا رنجیت سنگھ حاکم پنجاب اس سے ناراض ہو کر سندھ پر حملہ کر دے

سیّد شہید حیدر آباد سے رخصت ہو کر شمالی سندھ میں حضرت پیر پاگارو (صاحب دستار و کلاہ) سید صبغت اللہ بن مرشد نام حضرت پیر محمد راشدؒ کے پاس پہنچے اور ان سے ملاقات کی۔ حضرت سید صبغت اللہ شاہ حریت پسند مومن تھے۔ اس لئے انہوں نے دینی حمیت کے تقاضوں کا احساس کرتے ہوئے حضرت سید شہیدؒ سے جہاد کے معاملے پر کاملاً اتفاق کیا۔ اور دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ جہاد کر کے شمالی ہند کے مسلمانوں کو سکھوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ سندھ میں بھی ایک عظیم مہم کا آغاز

کیا گیا اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی جانے لگی۔ درزیوں کے ایک طائفہ کو بلا کر حکم دیا کہ مجاہدین کے لیئے جنگی لباس تیار کریں اور اپنے مریدوں اور جاں نثاروں کی ایک جماعت کو حضرت سید شہید رح کے ہمرکاب کر دیا۔ یہ پہلی جماعت تھی جو حُروں یعنی احرار کے نام سے موسوم ہوئی۔

سید صبغت اللہ شاہ رح نے اس جماعت کو سامان حرب و ضرب سے لیس کر کے سید احمد شہید رح کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ اور ان کی مزید معاونت کے لیئے سندھ میں رہے۔ بعض علمائے حق جنہوں نے جذبۂ حریت اور اعلائے کلمۃ الحق کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ حضرت سید صبغت اللہ شاہ کی اپیل پر پروانہ وار مجاہدین (حروں) کی جماعت میں بغرض جہاد شامل ہو گئے تاکہ سید احمد شہید کو مزید کمک بہم پہنچائی جائے۔ چنانچہ قاضی عثمان السندھی جو شوکانی رح کے شاگردوں میں سے تھے اور محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ واپس اپنے وطن آ گئے اور حُروں کے ایک طائفہ میں مجاہدانہ طور پر شرکت کی۔ اس عالم حق کے اسلحۂ جنگ میں سے ایک خنجر ابھی تک ان کی اولاد کے پاس محفوظ ہے۔ اور ان کی کتابوں میں ایک قلمی نسخہ جو امام ابن تیمیہ رح کے رسائل پر مشتمل ہے (جن میں سے بعض ابھی طبع نہیں ہوئے) سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کی لائبریری میں موجود ہے۔

سیّد احمد شہید رح کو پہلے پہل اس جہاد میں نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں۔ لیکن آخر کار حالات نے پلٹا کھایا اور ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ میں آپ شہید ہو گئے۔ آپ کی تاریخ وفات کا جو قطعہ آپ کے مزار واقع بالاکوٹ کی لوح پر مندرج ہے (اور جو ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان اور ڈاکٹر حضور احمد سلیم اساتذہ سندھ یونیورسٹی کی معرفت ملا ہے)

اس سے آپ کی شہادت کی تاریخ اور سال کا پتہ چلتا ہے ۔

حضرت سید شہیدؒ کی ناکامی کے اسباب میں سے غالباً ایک سبب یہ بھی تھا ۔ کہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ یکم رمضان ۱۲۴۶ھ میں فوت ہو گئے اور وہ فوجی اور افرادی امداد جو ان کی طرف سے حضرت شہیدؒ کو ملتی تھی اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا بلکہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ کی ذات سے حضرت شہیدؒ کا ایک بازو ٹوٹ گیا ۔ کیونکہ حضرت شہیدؒ حضرت سید صبغت اللہ شاہ کو سندھ میں اپنا رفیق دمعاون تصور کرتے تھے ۔ اور اپنے اہل و عیال بھی ان کے سپرد کر گئے تھے ۔ ان کا ایک مکتوب حضرت سید صبغت اللہ شاہ کے نام اس ساری حقیقت کا آئینہ دار ہے ۔ اس خط کا مضمون مندرجہ ذیل ہے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از طرف امیر المومنین سید احمد شہیدؒ

بخدمت جناب سید صبغت اللہ شاہ صاحبؒ

بابرکت سجادہ نشین محفل ارشاد و تلقین ۔ رہنمائے ارباب صدق و یقین مرجع مستفیدین ۔ ہادی راہ الہ ۔ مخدومی حضرت شاہ صبغت اللہ صاحب مدظلہٗ بعد سلام مسنون دعا کا طلبگار ہوں

واضح ہو کہ جناب کے گرامی نامے جو بلند ہمتی کی ترغیبات اور عزائم کی بلندیوں اور سنت کے زندہ رکھنے اور جہاد کے قائم کرنے اور کفر و دشمنی کو مٹا دینے پر مشتمل ہیں ۔ مضمون مکتوبات گرامی نے جو اجمال اور تفصیل کے ساتھ فصیح و بلیغ زبان میں قرآنی آیتوں سے مزین تھے ۔ ہم نے اور جاننے والوں کی کیفیت سے آگاہ کیا

یقیناً اس امرِ عظیم کو اختتام تک پہنچانا آنجناب جیسے مقبول بارگاہِ ایزدی ہی کو لائق ہے ۔

یہ کام آپ ہی جیسی ہستیاں انجام دے سکتی ہیں
بہادر ہی ایسے کام سر انجام دے سکتے ہیں

بے شک آپکی تشریف آوری اس کوہستان اور خارزار میں طالبین کے لئے باعثِ خیر و برکت ہوگی ۔ اور محفل فقرا اور عام مومنین کا آپکے گرد جمع ہو جانا آپ کی ہمت عالیہ سے بعید نہیں ہے ۔

لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ مخلصین اور محبین بلکہ تمام مومنین کو اکٹھا کریں اور ایسے مقام پر جو دشمنوں کے غلبہ سے محفوظ ہو اور کافروں اور سکھوں کی سرحدوں کے قریب ہو ۔ لیکن ظالموں کے نقصان سے مامون ہو ۔ قیام فرمائیں اور اس فقیر کے اہل و عیال کو بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایسی ہی جگہ میں رکھیں یا اس کے علاوہ کسی دوسری محفوظ جگہ مقیم ہوں اور معرکہ جہاد کافروں پر بہادری سے جاری رکھیں اور ہمت کا ہاتھ دائیں اور بائیں بڑھاتے رہیں اور کافروں کی بستیوں کو مجاہدین کے سفر کا مرکز بنا کر دینِ متین کے ستارہ کو عروج پر پہنچائیں ۔ یہاں تک کہ جس جگہ ممکن ہو جہاد فی سبیل اللہ کی تکبیر کے نعروں سے کفر اور فساد کا استیصال فرمائیں "

(لبِ تاریخ سندھ صفحہ ۲۵۸)

(بحوالہ سوانح احمدی از مولانا محمد جعفر تھانیسری)

اس مکتوب گرامی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے ۔ کہ حضرت شہیدؒ کے نزدیک حضرت سید صبغت اللہ شاہ کا بہت احترام تھا اور انہیں

میدانِ جہاد میں اپنا ہمدم اور ہم قدم سمجھتے تھے۔

حُروں کی تحریک کی ابتدا ہی اس بات سے ہوئی تھی کہ مسلمانانِ ہند اپنی کھوئی ہوئی آزادی دوبارہ حاصل کرلیں۔ بعد ازاں جب حضرت سید صبغت اللہ شاہ فوت ہوگئے تو ان کی پیدا کی ہوئی روحانی اور عسکری اسپرٹ اور جذبۂ جہاد نے اس گروہ کو ہمیشہ انگریزی استعمار کے خلاف نبرد آزما کیا۔ حتیٰ کہ ۹۶-۱۸۹۵ء میں انہوں نے سندھ میں انگریزوں کے خلاف عام بغاوت کردی۔ یہ حضرت سید احمدؒ کے بعد حُروں کی دوسری جدوجہد آزادی تھی۔"

ان حالات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے۔ کہ مولف "لبِ تاریخ سندھ" نے اپنے آقا (انگریزی سرکار) کی وفاداری اور نمک حلالی کا ثبوت دینے کے لئے حُروں کی تحقیر کی ہے۔ "قدیم سندھ" کے مصنف مرزا قلیچ بیگ نے بھی حُروں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ قبول نہیں۔

غالباً ایسی ہی غلط روایات سے متاثر ہو کر صاحب "آبِ کوثر" نے بھی ایسے قیاسات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کتاب کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ بلا تحقیق اس قسم کی بدگمانیاں کس طرح بعض نہایت معتبر اور مستند کتابوں میں جگہ پا گئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" سندھ کے مسلمانوں میں پیر پرستی زوروں پر ہے۔ اور گاہے گاہے پیر پرستی کے عجیب وغریب کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ اسکی نمایاں مثال حُر لوگوں کا نظام ہے۔ جو پیر پگاڑو (پگڑی والے پیر) کے معتقد ہیں ان لوگوں کا مرکز روہڑی کے نزدیک کنگری نام کا ایک گاؤں ہے جس میں پیر کا گوٹھ آباد تھا۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے مرشد کا مورث

اعلیٰ پیر شاہ علی مکیؒ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آیا اور ایک نومسلم کی بیٹی سے شادی کی وہ کثیر الاولاد تھا اور اس کے مریدوں کی تعداد بھی بہت ہوئی۔ اس خاندان نے مرورِ زمانہ سے بڑی وسعت حاصل کر لی۔ جانشینی کے سلسلے میں کئی دفعہ دعویداروں میں مخالفت کا بازار گرم ہوا۔ ایک دفعہ ایک ہنگامہ میں پیر صبغت اللہ صاحب (جن کے مولانا سیدؒ احمد بریلوی سے گہرے تعلقات تھے) کے معتقدوں نے عہد کیا کہ وہ سوائے پیر پگاڑو کے یعنی اس پیر کے جسے پیشرو سے دستارِ خلافت ملی ہو۔ کسی کے قائل نہ ہونگے۔ پیر نے ان راسخ الاعتقاد مریدوں کو حُر کا خطاب دیا ان لوگوں نے اپنے مرشدوں کی خوشنودی اور ان کے مخالفین بلکہ ان کے اقربا اور خلفا کا قلع قمع کرنے میں انتہائی سرگرمی دکھائی ہے اور اب سندھ میں ان کا شمار جرائم پیشہ اقوام میں ہوتا ہے۔ ان کی روک تھام کے لئے ایک خاص ایکٹ ہے۔ ان کی پولیس کے ساتھ کئی جھڑپیں ہوئی ہیں اور بعض اوقات تو فوج کی مدد منگانی پڑی ہے"

خواجہ حسن نظامی اپنی کتاب فاطمی دعوتِ اسلام میں لکھتے ہیں:۔

"حُر فرقے کے ہزاروں آدمی پیر صاحب کو ذاتِ الٰہی کا مظہر اور اوتار سمجھتے ہیں (اگر کوئی شخص پیر صاحب کے برابر بیٹھ جائے یا ان سے مصافحہ کرے۔ تو یہ جاہل لوگ اسے قتل کر ڈالتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے میں پیر صاحب نور کا ایک پتلا ہیں۔ اور خاکی انسان جو گناہوں کی ایک پوٹ ہے۔ اگر پیر صاحب کے قریب بیٹھے یا ان سے ہاتھ ملائے تو نورِ خدا کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس واسطے وہ واجب القتل ہے۔ حُر قوم کے آدمی پیر کے مکان کے دروازے

کا دیدار کر کے چلے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ناواقفیت اور تحقیق کی کمی کی وجہ سے ہی لکھا گیا ہے۔ کون اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ جس جماعت کا مرشد ایک ایسی شخصیت ہو جس کے آباؤ اجداد تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں یہاں آئے اور جن کے رشد و ہدایت کی وجہ سے سندھ اور بیرونِ سندھ کے لاکھوں غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور جس نے خود جہاد فی سبیل اللہ میں نمایاں کردار ادا کیا، اس جماعت کو خلافِ اسلام تعلیم دی گئی ہو۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ حضرت پیر صاحب پاگارہ کے خاندان اور حُر جماعت کے خلاف جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ سب فرنگیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس جماعت کا اعلیٰ اسلامی کردار و اخلاق قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی مثالیں پیش کرتا ہے۔

حُر جماعت کا کردار

یہ جماعت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کے قرآنی حکم پر پوری طرح پابند رہتی آئی ہے۔ وہ اپنے مرشد کو اولی الامر کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اس کے ہر حکم کو جو کہ دین اسلام کے خلاف نہ ہو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ یہ طریقت کا وہ اصول ہے جو اسلامی تصوّف کے ہر سلسلہ کا بنیادی نکتہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جسے کسی بھی حالت میں غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جیسے کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ تصوّف اسلام کے خلاف نہیں بلکہ وہ صدق دل اور باطن کی پاکیزگی کے ساتھ شریعت کے اصولوں اور احکامات پر عمل کرنے کا نام ہے۔ اس لئے اس

جماعت کو طریقت کی راہ پر چلنے سے پہلے شریعت کی پابندی کا سبق دیا گیا ہے۔ جس پر وہ شروع سے عمل پیرا رہی ہے۔

اس جماعت کے لئے صوم و صلوٰۃ کو پابندی کے ساتھ قائم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسے ساز و سرود کے استعمال سے روکا گیا ہے۔ اس کے افراد رنگین کپڑا پہن نہیں سکتے۔ ان کے لئے ننگے سر چلنا ممنوع ہے۔ ان پر ہر نماز اور خصوصاً عشاء کی نماز کے بعد ذکر جلی کی پابندی عائد کی گئی ہے۔ انہیں اپنے چہروں کو متشرع رکھنے اور سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کی پیروی کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور ہمیشہ پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ رہنے کو کہا گیا ہے اس کے علاوہ اس جماعت کو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنے۔ جھوٹ نہ بولنے۔ منشیات سے پرہیز کرنے۔ شرافت، بردباری حق گوئی۔ نیک نیتی اور اس قسم کی تمام اسلامی اقدار کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایسی جماعت پر اپنے مرشد کو مظہر خدا تصوّر کرنے اور بدعقیدہ ہونے کا الزام لگانا۔ اسے ڈاکو اور دہشت پسند کہنا کتنا مضحکہ خیز ہے۔ مزید مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس قسم کے الزامات ایک فاسق اور فاجر قوم یعنی فرنگیوں کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔ یا ان لوگوں کی طرف ہے جو انگریزوں کے حاشیہ بردار تھے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے الزام تراشیوں کی بوچھاڑ خود اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت پیر سائیں پاگارہ اور انکی جماعت کے خلاف لگائے گئے تمام الزامات غلط اور ناقابل تسلیم ہیں

دونوں بزرگوں کا ایک دوسرے سے تعلق

"تذکرہ صوفیائے سندھ" کے مصنف جناب مولانا اعجاز الحق قدوسی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:-

" دونوں کے خلوص ومحبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید نے اپنے اہل وعیال کو پیر گوٹھ میں ہی سید صبغت اللہ کی حفاظت میں چھوڑا۔ دونوں میں مسلسل خط وکتابت ہوتی رہی حضرت سید احمد شہید کی روانگی کے وقت غالباً دونوں میں یہ فیصلہ ہوا کہ جب صحیح طور پر جنگی مرکز قائم ہو جائے گا تو سید صبغت اللہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ سید صبغت اللہ جانے کے لئے بالکل تیار تھے اور اسکی اطلاع آپ نے حضرت شہید کو دے بھی دی تھی، کہ اچانک افغانستان اور پشاور کا راستہ ایرانی سرداروں کے عناد کی وجہ سے مخدوش ہوگیا اور آپ مجبوراً وہاں نہ پہنچ سکے۔"

جو اعتماد خلوص اور محبت حضرتِ شہید کو حضرت صبغت اللہ سے تھی اس کا اندازہ اُن خطوط سے ہوتا ہے جو آپ نے سید صبغت اللہ کو مختلف اوقات میں لکھے ہم ان میں سے چند خطوط کے اقتباسات یہاں درج کرتے ہیں:-

ایک خط میں میدانِ جہاد سے صبغت اللہ کو تحریر فرمایا:- "آپ تمام مسلمانوں کو دعوت دیں اور مخلصین کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر سکھوں کی سرحد سے متصل محفوظ مقام پر بیٹھ جائیں اور جہاد شروع کر دیں اپنے اہل وعیال کے ساتھ میرے اہل وعیال کو بھی کسی ایسی جگہ بٹھا دیں جو دشمن کی دسترس سے باہر ہو"

ایک دوسرے خط میں انہوں نے حضرت سید صبغت اللہ شاہ کو لکھا :-

" اگر ہماری زندگی جہاد میں ہی پوری ہو جائے تو ہمارے اہل وعیال کو حرمین شریفین پہنچا دیں "

پاگارو اور حُر کا نقطۂ آغاز

اس سلسلے میں مختلف روایات ملتی ہیں " قدیم سندھ " کے مصنف لکھتے ہیں کہ :-

۱- پیر راشد کے تیرہ بیٹے تھے ۔ ان کی وفات کے وقت دستار خلافت پر جھگڑا ہوا ۔ لیکن انہوں نے اپنے بیٹے صبغت اللہ کو وارث بنایا ۔ جنہوں نے دریائے نارہ کے آس پاس بہت سے مرید کئے دوسرے بھائیوں نے ان کو (پیر کو) مارنے کی کوشش کی ۔ لیکن ان کے مریدوں نے باہم اتفاق کر کے یہ طے کر لیا کہ اپنے پیر کے علاوہ کسی دوسرے کی فرماں برداری نہ کریں گے ۔ اس نمک حلالی اور جاں نثاری کی وجہ سے پیر صاحب نے حضرت حُرؓ کی رعایت سے ان کا نام حُر رکھا ۔ یعنی جیسے انہوں نے حضرت امام حسینؓ کی خاطر شہادت پائی تھی ۔ اسی طرح یہ مریدین بھی اپنے پیر کی خاطر شہادت پانے کے لئے تیار ہیں "

" لب تاریخ سندھ " میں مذکور ہے کہ :-

۲- " سید محمد راشد پہلی شعبان ۱۲۳۳ھ بمطابق ۱۸۱۸ء میں فوت ہو گئے ۔ ان کے دو بیٹے تھے ۔ سید میاں صبغت اللہ شاہ جو پہلے پیر پاگارو ہیں اور دوسرے سید محمد یاسین شاہ جو صاحب عَلم یا جھنڈے والے مشہور ہوئے "

صاحب "صوفیائے سندھ" رقمطراز ہیں کہ :۔

۳:۔ "حضرت پیر محمد راشد کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے پیر صبغت اللہ شاہ اوّل مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے اور دستارِ سجادگی ان کے سر پر باندھی گئی۔ اس خاندان کے یہ پہلے پیر ہیں جو "پیر پاگارہ" (صاحبِ دستار) کے لقب سے مشہور ہوئے ان کے دوسرے بھائی پیر محمد لیٰسین جھنڈا یا علم لیکر دوسری جگہ چلے گئے۔ اسلئے انہوں نے پیر جھنڈا کے لقب سے شہرت پائی ۔"

یہ تینوں روایات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ سے پہلے بھی ان کے آباؤ اجداد میں یہ سلسلہ اور طریقہ تصوّف جاری تھا۔ پھر وہ بزرگ پاگارو (پگڑی والے) کیوں نہ کہلائے اور یہ لقب حضرت سید صبغت اللہ شاہ اور ان کے بعد کے سجادہ نشینوں کے لئے کیوں مخصوص ہے؟ اگر سجادگی کی وجہ سے ہی حضرت پیر صبغت اللہ شاہ پیر پاگارو کہلائے تو پھر پہلے والے بزرگوں کو بھی پیر پاگارو کہلانا چاہئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے بھائی پیر محمد لیٰسین شاہ کو پیر جھنڈا کا لقب کس نے دیا اور کیوں دیا؟ کیا اس سے پہلے بھی اس خاندان میں جھنڈا دینے کا رواج تھا؟

ان سوالوں کا معقول جواب پہلی روایت سے ہی اخذ کرنا مناسب ہے چونکہ سید محمد راشد کے بیٹوں میں اختلاف دستار پر تھا۔ اسلئے اس کے طے ہو جانے کے بعد پاگارو کا لفظ مستعمل ہونے لگا۔ سید لیٰسین صاحب کو جھنڈا عطا کیا گیا کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لئے علم تبلیغ بلند رکھیں۔ اور دونوں بزرگ اپنی اپنی امارت کے نشانوں کی رعایت سے پیر پاگارو اور پیر جھنڈو کہلائے اور یہ سلسلہ آج تک بدستور قائم ہے اور دونوں گدیاں ان ہی القاب سے موسوم ہیں

لفظ حُر کے متعلق بھی گذشتہ صفحات میں بیان کی گئی روایات محض قیاس

وظن ہیں۔ کیونکہ ان دونوں بزرگوں (حضرت شہید اور حضرت صبغت اللہ) کے درمیان

حریت پسندی پر اتفاق رائے ہونے کے بعد مجاہدین اور مردانِ احرار کی بھرتی کے

لئے مختلف پروگرام طے پائے تھے جریت پسندی کی رعایت سے اس میں حصہ لینے والے

مجاہدین حُر کہلائے۔ کیونکہ یہ جہاد مسلمانوں کو انگریزوں اور سکھوں کی غلامی سے

نجات دلانے کے لئے کیا گیا تھا۔ اور غلامی سے نجات حاصل کرنا صرف اسی صورت

میں ممکن ہے جب حریّت پسندی کی روح بیدار کی جائے اور جہاد دفاعی جنگ نہ ہو

نہ دوسرے ملکوں کی سرحدات سے گذرنے کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ مسلمانوں کی

غلامی کو آزادی میں تبدیل کیا جائے۔ سید عطأاللہ بخاری کی جماعت احرار اسلام بھی

اس کی غمازی کرتی ہے۔ کیونکہ ان کے پیش نظر بھی انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل

کرنا تھا۔ اس لئے حُر کے لفظ کو خواہ مخواہ میدان کربلا کے مُجاہد حضرت حُر رضی کے لفظ

سے نسبت دینا محض گمان ہے جسکی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ سب کچھ ان لوگوں

نے کہا اور سمجھا ہے جنہوں نے حُریت پسندی پر غور نہیں کیا۔ صاحب" تذکرہ صوفیائے

سندھ" نے اگرچہ کھل کر یہ بات نہیں کہی ہے۔ لیکن حضرت حُر کی مناسبت سے لفظ حُر

کے لقب کو انہوں نے بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حُر کے لقب کی

وجہ صرف یہ لکھی ہے۔

> "انہیں مریدوں میں سے سید صبغت اللہ نے ایسے سرفروش اور جانباز مجاہدوں کی جماعت تیار کی۔ جو وقت پڑنے پر ملّتِ اسلامیہ کے لئے اپنی جان کی بازی لگا سکیں۔ انہیں مجاہدین کو حُر کا لقب دیا گیا اور یہی حُر تحریک کا پہلا نقطہ تھا"

بھیج پاگارو کا نعرہ

یہ حُر جماعت کا خاص نعرہ ہے۔ جو دو الفاظ "بھیج" اور "پاگارو" سے بنا ہے۔ "بھیج" کے معنی ہیں "بھیجئے" حُر جماعت کے افراد کے یہاں اس نعرہ کا مطلب یہ ہے کہ "اے پروردگار حضرت پیر سائیں پاگارو کو ہمارے پاس بھیجئے"۔ سندھ میں لفظ "بھیج" اس وقت بھی عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔ جب مطلع ابر آلود ہو اور بارش مطلوب ہو اس وقت بھیج کا نعرہ لگایا جاتا ہے جس کا مطلب ہے اے پروردگار بارانِ رحمت کو ہمارے پاس بھیجئے۔

حضرت سیّد صبغت اللہ شاہ اوّل کا وصال

آپ برصغیر ہند و پاکستان میں تاریخ آزادی کی وہ شمع فروزاں تھے جس کی روشنی ۱۹۴۷ء تک غلامی کی تاریکیوں میں رہنمائی کرتی رہی۔ آپ علم و عرفان کے ساتھ ساتھ صاحب سیف و قلم بھی تھے۔ آپ تاریخ آزادی کا وہ روشن عنوان ہیں جن کو ملّتِ اسلامیہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی

آپ کا وصال ۵ رمضان ۱۲۴۶ھ بمطابق ۸ فروری ۱۸۳۱ء کو پیر گوٹھ میں ہوا۔ وہیں آپ کا روضہ بھی ہے۔

باب چہارم

حضرت پیر علی گوہر شاہ اوّل سے حضرت پیر شاہ مردان شاہ اوّل تک

حضرت سیّد علی گوھر شاہ اوّلؒ سے حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ تک

حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول الملقب بہ پیر پاگاروؒ کے دو بیٹے تھے۔ سید علی محمد شاہ جن کی اولاد میں سے سندھ کے جانے پہچانے اہلِ قلم پیر علی محمد راشدی اور ان کے چھوٹے بھائی پیر حسام الدین راشدی ہیں۔ دوسرے بیٹے پیر علی گوہر شاہ تھے جو آپ کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ اس طرح آپ دوسرے پیر پاگارو تھے۔ آپ "بنگلے دھنی" کے لقب سے معروف ہیں۔ آپ کا تخلص اصغر ہے۔ آپ کی وفات ۱۱ رجادی الاوّل ۱۲۶۳ھ بمطابق ۲۸ راپریل ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔ آپ کے وقت میں تحریک مجاہدین کا ایک گروپ آزاد علاقہ کی طرف جاتا ہوا پیر گوٹھ میں آیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک آزادی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے سلسلہ میں

آپ کے گوٹھ کو سندھ کا مرکزی مقام سمجھا جاتا تھا. ہم اس سلسلے میں "موجِ کوثر" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

" مولوی سید نصیر الدین دہلوی (جو حضرت سید احمد شہید کے خلفا میں سے تھے) اپنے رفقاء کے ساتھ ۲، اپریل ۱۸۳۵ء کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ ٹونک میں وزیر الدولہ نے شہر سے باہر قافلے کا استقبال کیا وہ مولوی صاحب کے بڑے مدّاح تھے اور فرماتے تھے کہ ان میں سید صاحب کا پَرتَو نظر آتا ہے۔ انہوں نے مجاہدین کی بڑے اعلیٰ پیمانے پر مہمان داری کی اور رخصت کے وقت انھیں ساز و سامان سے لیس کیا۔ اسلحہ مثلاً تلواروں. بندوقوں کے علاوہ اونٹ گھوڑے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔ نیز فرش. خیمے. بڑی جائے نماز بیں گھڑیال۔ ایک بڑی دیگ اور دوسرا سامان توشہ خانہ ریاست سے ملے نواب نے تمام مجاہدوں کے لئے دستاروں. انگرکھوں، پاجاموں کمر بندوں اور پاپوشوں کا انتظام کر دیا. نقد روپیہ بھی دیا اور مستعد مجاہدین بھی ٹونک سے شریک ہوئے۔ ٹونک سے اجمیر. جودھپور (جہاں آپ کے کئی ساتھی آپ کو چھوڑ گئے) جیسلمیر کو کٹھار و. خیر لور ہوتے ہوئے یہ قافلہ حُروں کے مرکز (پیر جو گوٹھ) پہنچا. جہاں سابق سجادہ نشین اور تحریک کے بانی پیر صبغت اللہ شاہ اول کے سید صاحب سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ وفات پا چکے تھے اور ان کے جانشین پیر علی گوہر شاہ تھے. لیکن جب مجاہدین پیر گوٹھ پہنچے تو پتہ چلا کہ پیر صاحب کچھ کی طرف دورے پر گئے ہیں. پھر خبر آئی کہ وہ سورت اور احمد آباد چلے گئے۔ غالباً مولوی صاحب کی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن

مولوی صاحب سندھ کو مرکز جہاد بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو یہاں پر مخلصانہ مدد ملے گی اور کم از کم ہندوستان کے قافلے یہاں راحت و آرام سے پہنچ سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے سندھ کے مختلف مقامات کے دورے شروع کیے تاکہ با اثر حلقوں کو تحریک سے وابستہ کرسکیں۔ جن سربرآوردہ حضرات سے انہوں نے ملاقات کی ان میں حیدرآباد کے میر صاحبان، ہالا کے مخدوم صاحب، ٹیاری کے سادات اور کھہڑہ، گمبٹ، کوٹ تاج محمد اور نوشہرہ کے سجادہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔ خیرپور کے وزیر سردار فتح محمد خان غوری اور وزیر قلات مختار الدولہ میر محمد حسن سے بھی اُمید افزا خط وکتابت ہوئی۔ سب نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعض نے تحفے تحائف اور ہدیئے بھی پیش کیے۔ لیکن تحریک جہاد کے لئے جس قسم کی سرفروشانہ اعانت کی ضرورت ہوتی ہے اسکا انتظام نہ ہوسکا۔ بالآخر معاملات پر پوری طرح غور کرکے مولوی صاحب نے مزاریوں کے علاقے کو جہاد کا محاذ قرار دیا۔ یہ علاقہ موجودہ ڈیرہ غازی خان کے جنوبی حصہ پر مشتمل ہے اور دریائے سندھ کے مغربی جانب کشمور (جہاں بالائی سندھ کی نہروں کا منبع گدو بیراج تعمیر ہوا ہے) تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس علاقے کو منتخب کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ ملتان کا گورنر دیوان ساون مل اس طرف اپنا اقتدار بڑھا رہا تھا اور مزاری اس سے برسرپیکار تھے۔"

آپ کے بعد آپ کے بیٹے پیر سید حزب اللہ شاہ الملقب بہ "تخت دھنی" سجادہ نشین ہوئے آپکا تخلص مسکین تھا۔ آپ کا انتقال ۲ محرم ۱۳۰۸ھ

بمطابق ۱۲ اگست ۱۸۹۰ء میں ہوا ان کے بعد ان کے بیٹے پیر علی گوہر شاہ ثانی مسند نشین ہوئے

ان تینوں بزرگوں کے حالات کو ۱۸۳۱ء سے لیکر ۱۸۹۰ء تک کے تاریخی پس منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔

سندھ پر انگریزوں کا قبضہ

یہ تو سب اہلِ علم جانتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنی ڈپلومیسی سے کام لیکر سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے پہلے میروں سے دوستانہ تعلقات بڑھائے۔ پھر افغانستان کی جنگ میں مدد نہ دینے کے بہانے ——— پنجاب کے سکھوں کا خوف دلا کر مرعوب کر لیا۔ اس طرح میدان ہموار کر کے بعض غداروں کو ساتھ ملالیا اور آخر ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ابھی تک ان کی گرفت اتنی مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ تاہم انہوں نے سندھ کے مالگذاری کے نظام میں تبدیلیاں کر کے اپنے گورنر اور کمشنر مقرر کر دیئے۔ جنہوں نے رفتہ رفتہ اپنا جال پھیلایا۔ اور سندھ پوری طرح ان کے زیر اقتدار آگیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں سندھ کا حصّہ

انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد مختلف علاقوں میں محبِ وطن لوگوں نے مایوس ہونے کی بجائے حصولِ آزادی کی خاطر مختلف راستے اختیار کئے شاہ ولی اللہؒ کے خاندان نے تزکیۂ نفس کے ساتھ جہاد کی روح سے مسلمانوں کو سرشار کیا۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین نے باقاعدہ جہاد سے انگریزوں اور سکھوں کو خطرات سے دوچار کر دیا۔ اور اگر بعض غدّار پشاوری سردار اپنے کمینہ پن سے کام نہ لیتے تو سکھوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا۔ دہلی کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو محبِ وطن غازیوں نے اپنا بادشاہ بنایا۔ اور پھر مختلف اسباب کی بنا پر میرٹھ وغیرہ سے اس جنگ آزادی کا آغاز ہوا جسے انگریزوں نے بغاوت کہکر کچلنے کا پورا پورا بندوبست کر لیا۔ پنجاب کے سکھ انگریزوں

موجودہ پیر پاگارہ کے پردادا حضرت پیر حزب اللہ شاہ (تخت دھنی) رحمۃ اللہ علیہ

کے لئے اس جنگ میں بازوئے شمشیر زن بن گئے اور انہوں نے دہلی کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی میں انگریزوں سے بڑھکر حصہ لیا۔ اس جنگ آزادی کا اثر برصغیر ہند و پاکستان کے ہر کونے تک پہنچا۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ سندھ خاموش رہتا۔ درآں حالیکہ اس میں مجاہدین کی معتدبہ تعداد موجود تھی۔ چنانچہ اس سرزمین میں بھی انگریزوں سے براہ راست لڑائی ہوئی۔ جس کا مختصر احوال درج ذیل ہے۔

۱۸۴۷ء میں چارلس نیپیر کے جاتے ہی انگریزوں نے گورنر سندھ کا عہدہ ختم کرکے سندھ کو بمبئی کے ساتھ ملحق کردیا ۱۸۵۴ء میں جاگیرداروں کو جاگیرداری کے پروانے دیئے گئے اور ۱۸۵۶ء مین کوٹڑی اور حیدرآباد کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی۔

سندھ کا بمبئی سے الحاق بالکل غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بمبئی کی ہندو اکثریت نے ہمیشہ مالیاتی اُمور کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کے لئے دباؤ ڈالا کہ سندھ کی مسلم اکثریت بمبئی کی ہندو اکثریت کے بوجھ تلے دبی رہے۔ چنانچہ سندھ کو کمشنر کے صوبے کی حیثیت سے بمبئی کے ماتحت رکھا گیا۔

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو سر بارٹل فریئر نے جنرل جان جیکب کو ایک خط لکھا کہ مجھے یہاں آنے کے بعد جو خبریں ملی ہیں وہ بہت پریشان کن ہیں۔ یہی حال لاہور سے آنے والی خبروں کا ہے۔ یہ خبر تمہارے اور اوٹرم کے مشورے کے لئے ارسال کررہا ہوں اسی طرح اوٹرم کو بھی لکھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں ہماری طاقت کس طرح محدود ہے خلیج فارس کے علاقے کے تم جس قدر سپاہی بھیجو گے وہ یہاں کے شمال مغربی علاقے میں بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔ براہ مہربانی یہ لکھو کہ تم کتنے فوجی جوان یہاں بھیج سکتے ہو۔ ان دونوں خطوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فریئر انقلاب ۱۸۵۷ء سے کسقدر پریشان تھا۔

سندھ کے حصہ لینے کی وجوہات

۱- ۱۸۴۳ء میں تالپور حکومت کے خاتمہ اور سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد یہاں کے سیاسی ماحول۔ ہندوؤں کی وفاداری اور انتظام سلطنت میں تبدیلی کی وجہ سے اہل سندھ یکایک ذہنی طور پر مفلوج ہوگئے تھے۔ انہیں نہ تو اپنے سیاسی مستقبل کا صحیح اندازہ تھا اور نہ ہی ان کے سامنے ایسے امور تھے جن کی مدد سے وہ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرتے۔ چنانچہ جب دہلی اور برصغیر کے اطراف میں اہلِ وطن نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا تو اہلِ سندھ نے یہ سمجھتے ہوئے اِس میں حصہ لیا کہ اب انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات مل جائیگی

۲- حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول نے اپنے مریدوں میں بالخصوص اوران کے ذریعہ دوسرے مسلمانوں میں بالعموم۔ جو جذبۂ حریت پیدا کر دیا تھا۔ وہ ایسے موقعہ پر ایک دم موجزن ہوگیا اور لوگ سر پر کفن باندھکر جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے کود پڑے۔

۳- انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد شمال مغربی سرحدی علاقے کے با اثر اور حریت پسند طبقہ کو زیادہ نقصان پہنچایا تھا اور پنجاب اور افغانستان کا خوف دلاکر اس علاقے پر اپنے مکروفریب سے قبضہ کرلیا تھا۔ پھر اس کے بعد جیکب آباد اور شکارپور میں اہم چھاؤنیاں قائم کردی تھیں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ حریت پسند طبقہ انگریزوں کے خلاف قدم نہ اٹھا سکے۔ لیکن جب برصغیر میں انقلاب آزادی کی لہر اٹھی تو اس علاقے کے غیور اور بہادر لوگوں نے انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے اعلانِ جنگ کیا۔

۴- خان گڑھ (جیکب آباد) شکارپور۔ کراچی اور حیدرآباد۔ انگریزوں کے قبضے سے پہلے بہت بڑی تجارتی منڈیاں تھیں۔ لیکن انگریزوں کے منحوس قدم پڑنے کے

بعد نسکار پوا ور جیکب آباد کی حیثیت ان کے سیاسی اغراض کی وجہ سے بالکل ختم ہو گئی اور انگریزوں کی سرپرستی میں ہندؤں نے ساری تجارت پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ یہی بات انگریزوں کے خلاف نفرت کا باعث بنی۔ اب جہاد آزادی میں شمال مغربی سندھ کے لوگوں نے بھرپور حصہ لیا۔

۵۔ سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے اپنے سیاسی مفادات کی تکمیل کے لئے ہندؤں کی بے جا سرپرستی شروع کردی۔ اس سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی حق تلفی کا شدت سے احساس پیدا ہوا اور انہوں نے انگریزوں سے بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

۶۔ سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کا ایک بہت بڑا مرکز پیر گوٹھ تھا۔ چنانچہ اس تحریک کے اثرات جو مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کے عین مزاج کے مطابق تھے۔ وہ بدستور زندہ تھے اور حضرت پیر صاحب پاگارو کے خاندان کے معزز افراد اسکی پرورش کررہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان اثرات نے بہت بڑا کام کیا۔

اس کے علاوہ اور بہت ساری وجوہات تھیں جنکی تفصیل میں جانا ہماری بحث سے خارج ہے۔

واقعات

انگریزوں کو اِس بغاوت کو دبانے کے لئے بہت سے غدارانِ وطن بھی مل گئے جنہیں انہوں نے جاگیریں وظیفے اور سندیں دیکر خرید لیا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ایک ہندو سیٹھ ناؤمل تھا جس نے مسلمانوں کی تباہی انگریزوں کی سربلندی اور ذاتی مفاد کی خاطر بہت سے کام کئے ہیں۔ یہ شخص ہوتچند کا بیٹا تھا۔ اور بھوج مل کا پوتا۔ اسکی اولاد آج تک بھوج وانی کہلاتی ہے اس کے آباؤ اجداد۔ خدا آباد کے پاس رہتے تھے۔ لیکن کلہوڑوں کے ایام حکومت میں

ناؤمل کراچی میں آگیا تھا۔ اور بحری راستہ سے دوسرے ملکوں میں تجارت کرتا تھا اس نے انگریزوں کی بہت خدمت کی تھی۔ اور اس صلے میں اُسے جاگیر اور سی۔ ایس آئی کا خطاب ملا تھا۔ اس نے ایک کتاب "یادگیریون" بھی لکھی ہے جسے سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ناؤمل کے مکر و فریب۔ انگریزوں کی خوشامد اور اس وقت کی ڈپلومیسی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا تالپوروں کے دربار میں بھی بہت بڑا اثر تھا۔ لیکن اس نے انگریزوں کے مفاد کی خاطر اپنے اہلِ وطن کو دھوکہ دیا اور میروں کی تمام باتیں انگریزوں کو بتاتا رہا۔ اس نے اپنی ان ساری سازشوں اور چال بازیوں کا ذکر اس کتاب میں لکھا ہے۔ اس نے سر بارٹل فریئر کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے:۔

"ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت کو جو خطرہ درپیش تھا۔ اس سے نمٹنے کے لئے میں نے اپنی تکلیف کا خیال کیا نہ روپیہ پیسہ کا۔ بلکہ حسبِ دستور اس سلسلے میں تمام اطلاعات سر بارٹل فریئر کو پہنچایا کرتا تھا میں نے اپنے پرانے خاندانی ایجنٹوں کے ذریعہ جودھپور۔ جیسلمیر۔ راجپوتانہ سندھ اور پنجاب کے مختلف علاقوں سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں اور انہیں بغیر کسی شرط یا معاوضہ کے ہمیشہ سر بارٹل فریئر کو بتادیا کرتا تھا۔ مجھے رات اور دن کے کسی بھی حصہ میں گورنمنٹ ہاؤس میں کمشنر سے ملنے کی اجازت تھی۔"

انگریزوں نے سندھ کو جنگ آزادی سے بچانے کے لئے یہاں بہت سی احتیاطی تدابیر بھی اختیار کیں یعنی جودھپور کے راستے کراچی کو کلکتہ سے ملا دیا گیا۔ انگریزی اور سندھی پریس پر گہری نظر رکھی۔ توپخانے کو خوب منظم کیا گیا۔ دریائے سندھ میں جہازوں کی آمدورفت کو برقرار رکھا گیا۔

سندھ میں تحریک آزادی کے کئی مرکز تھے۔ ان میں کراچی۔ حیدرآباد۔ شکارپور اور جیکب آباد سر فہرست ہیں انہیں حیدرآباد کو اولیت حاصل تھی۔ انقلابیوں کا ارادہ تھا کہ حیدرآباد پر قبضہ کے بعد خیرپور۔ روہڑی۔ بہاولپور اور ملتان پر قبضہ کیا جائے اس انقلاب میں حصہ لینے والے لوگوں میں کراچی کے دیسی سپاہیوں کی پلٹن نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ جس میں عام طور پر اودھ۔ لکھنؤ اور دلی کے باشندوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شکارپور میں حیدرآباد کے چاکرانی قبیلے کا سردار دریا خان انقلابیوں کا رہنما تھا۔ اس کے ساتھ جیکب آباد کا علی مراد خان کھوسو بھی شامل تھا جس نے انقلاب کی ابتدا میں شکارپور اور جیکب آباد میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بلوچوں کے ان تمام قبیلوں میں حُر مجاہدین کی اکثریت تھی۔

۱۸۵۷ء کے اس عظیم انقلاب کے متعلق "لب تاریخ سندھ" کا مصنف لکھتا ہے،

"۱۸۵۷ء میں ایک عام بغاوت کا بہت بڑا فساد ملک ہندوستان کے اکثر حصوں میں رونما ہوا۔ اسکی دیکھا دیکھی سندھ کے بڑے بڑے شہروں یعنی حیدرآباد۔ کراچی۔ شکارپور اور جیکب آباد میں بھی بعض عملداروں اور سپاہیوں نے اپنی پلٹن سے نکلکر اس شورش اور فساد میں حصہ لیا لیکن اسوقت کے افسران بالا کی فراست اور اہلیت اور آنریبل گبسن کی صلاحیت کی بناپر جو اس زمانہ میں جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر سندھ تھے اس مشکل مہم کو اس طریقہ سے حل کیا گیا کہ فسادی بروقت پکڑے گئے اور ان کو انکے کیئے کی بہت سزا ملی۔ چنانچہ بعض کو توپ سے اُڑا دیا گیا اور بعض کو پھانسی دی گئی۔ اس مشکل دور میں جن لوگوں نے انگریزوں کی مدد کی اور خیرخواہی کی وہ انعام سے نوازے گئے"۔

انقلاب میں اہل سندھ کی شکست اور اسکے اسباب حیدرآباد اور کراچی کے بعد

ننکار پور اور جیکب آباد انقلاب کے بہت بڑے مرکز تھے کیونکہ یہاں کے قبائل بہادر اور غیور تھے اور سید احمد شہید اور حضرت سید صبغت اللہ شاہ نے جو آزادی اور جہاد کی روح ان میں پھونک دی تھی اس نے آزادی کے حصول کی خاطر انہیں ہر میدان میں آگے بڑھایا۔

۱۸۵۷ء کے حوالے سے سیٹھ ناؤمل لکھتا ہے کہ مجھے خطرہ تھا کہ بغاوت کی بنا پر سرکار کو مسلمان سپاہیوں پر اعتبار بالکل نہ ہوگا کیونکہ ہندوستان کا غدر ایک جہاد کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں نے ایک دن سر بارٹل فریئر کو لکھا کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو میں افریقہ سے دو چار ہزار آدمی لے آؤں کیونکہ ان میں تعصب بالکل نہ ہوگا اور دوسرا یہ کہ وہ بہادر ایماندار اور وفادار سپاہی ہونگے۔ میں تین سے چار ہزار آدمی دو تین ماہ میں لیکر آسکتا ہوں۔ بشرطیکہ گورنمنٹ ایک دخانی کشتی میرے حوالے کر دے کیونکہ چھوٹے جہاز کے سفر میں بہت زیادہ عرصہ لگے گا۔"

وہ اس سلسلہ میں مزید لکھتا ہے کہ :-

" فریئر میرے جوش و خروش کو دیکھکر بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس نے سیٹھ ناؤمل کو ستارۂ ہند کا اعزاز دینے کے لئے فریئر ہال کراچی کے دربار میں جو یکم جنوری ۱۸۶۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ کہا: "۱۸۵۷ء کے مشکل وقت میں تم نے جو ہماری امداد کی اس کے لئے ہم تمہارے شکر گذار ہیں۔ تمہارا اپنے ملک کے عوام پر بہت اثر ہے تمہیں شمالی اور جنوبی ہندوستان کے ہر حصّہ سے جو خبریں ملتی ہیں وہ سب تم فوراً گورنمنٹ کو پہنچا دیتے ہو۔ اسوقت جب کہ تمہارے کئی ہم وطن خطرہ سر پر دیکھکر لرز اٹھے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا چراغ

گل ہونے کو ہے تو بھی تمہاری وفاداری میں بالکل لغزش نہیں آئی۔ اگر تم بھی ان مجاہدوں میں ہوتے جنہوں نے انگریزی حکومت کے لئے جانیں قربان کی ہیں تو بھی اس وقت تمہارا انگریزوں کی فتح میں اتنا یقین نہ ہوتا جتنا کہ تم نے اس کڑے وقت میں ظاہر کیا"۔

ناکامی کی وجوہات

برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح سندھ میں بھی انگریزوں نے جنگِ آزادی میں فتح حاصل کی اور انقلابیوں کو کچل کر رکھ دیا جس کی چند وجوہات یہ ہیں :-

۱۔ سندھ کے انقلابیوں کی بروقت تیاری اور شیرازہ بندی نہ ہو سکی۔

۲۔ اس انقلاب عظیم سے چودہ سال پہلے انگریز سندھ پر قابض ہو چکے تھے اور انہوں نے ہر لحاظ سے اہل سندھ کو مفلوج کر دیا تھا۔

۳۔ انقلابیوں کو اعلیٰ صلاحیتوں والا کوئی فوجی راہنما نہ مل سکا۔

۴۔ سندھ میں انقلاب کے مرکزوں کا آپس میں کوئی رابطہ قائم نہ تھا۔

۵۔ انقلابیوں کا نظام جاسوسی نہ ہونے کے برابر تھا اور انگریزوں کے جاسوس چپے چپے میں پھیلے ہوئے تھے۔

۶۔ سندھ کے بعض با اثر رئیس انگریزوں کی حمایت میں رہے جس سے انقلابیوں پر بُرا اثر پڑا اور انھیں بروقت امداد نہ مل سکی۔

ناکامی کے اثرات

۱۔ سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد ہندوؤں کو بہت عروج حاصل ہوا وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان دوبارہ برسرِ اقتدار آئیں۔ اس لئے انہوں نے ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی پوری پوری کوشش کرنی شروع کر دی اور انگریزوں نے ان کی ہر ممکن سرپرستی کی تاکہ مسلمان احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے

کے قابل نہ رہیں۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے بااثر افراد کو جاگیروں، سندوں اور دولت کے لالچ میں جکڑ کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

محکوم اور مغلوب ہو جانے والی قومیں ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتی ہیں اور احساسِ کمتری ان پر غالب آ جاتا ہے۔ ان حالات میں انہیں صرف اپنی بقا کا خیال رہتا ہے اور مادی منفعت حاصل کرنے کے لئے افراد ایک دوسرے سے بڑھکر اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے پرستار ہو جاتے ہیں۔

محبِ وطن، اہلِ درد، اہلِ عزیمت اور حریت پسند اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں اور مناسب مواقع کی تلاش میں بظاہر اپنی سرگرمیوں سے محترز ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ جوشیلے ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ موردِ عتاب رہتے ہیں۔ اور حکومت کے پٹھو انہیں بدنام کرنے اور کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے ہر وقت سرگرمِ عمل ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایسے جانبازوں اور مجاہدوں کے تذکرے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ان کے افکار و نظریات "پُرخطرناک" کی چھاپ لگ جاتی ہے اور کارہائے نمایاں کسی سرکاری یا غیر سرکاری دستاویز کے صفحوں میں جگہ نہیں پا سکتے۔ پریس، مصنف اور مؤلف سب اپنی ضمانت اور سلامتی کے خوف سے ان تذکروں کو شجرِ ممنوعہ سمجھ لیتے ہیں یہی حال حُر مجاہدین کی کارروائیوں کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ سندھی ادب میں کہیں بھی ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اور اگر کہیں ان کا ذکر آتا بھی ہے تو ذکرِ خیر نہیں ہوتا بلکہ انہیں باغیوں، ڈاکوؤں، رہزنوں اور ظالموں کے رُوپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ۱۸۴۳ء سے ۱۸۹۰ء تک ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں نے یا تو عمداً ان کے تذکروں سے چشم پوشی کی ہے تاکہ انگریز سرکار ان سے ناراض نہ ہو جائے یا ان کے مرشدوں نے مصلحتاً انہیں انگریزوں سے ٹکرانے سے منع کر دیا ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تباہی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بغیر کسی خاص تیاری اور جمعیت کے

انگریز حکومت سے ٹکرانا جماعت کو بربادی کے راستہ پر ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس لئے پیر صاحب نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنی جماعت کو صبر اور خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ یہ ہدایت جماعت کے جن لوگوں تک پہنچ سکی انہوں نے تو اپنی سرگرمیاں بند کردیں۔ باقی گھنے جنگلوں اور کمین گاہوں میں رہنے والے حُر ان ہدایات سے بے خبر رہے۔ اس لئے ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ عام حُروں کی خاموشی سے انگریزوں نے یہ تاثر لیا کہ حضرت پیر صاحب پاگارو ان کے خیر خواہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے سندھ کے کمشنر نے "لب تاریخ سندھ" کے مولف کو کچھ تحائف دیکر پیر صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ ایک بھرے اجلاس میں پیر صاحب کو پیش کریں۔

ان تحائف میں ایک تلوار اور آفرین نامہ بھی تھا۔ پیر صاحب نے ان تحائف کو اس لئے قبول کرنے سے انکار نہیں کیا کہ مبادا انگریز اصل حقیقت سمجھ لیں کہ حُروں کو خاموش رہنے کی تلقین محض دفع الوقتی کے طور پر کی گئی ہے۔

انگریزوں کے خلاف حُروں کی گوریلا جنگیں

"لب تاریخ سندھ" کے مولف نے سرکاری پرچہ نویس کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حُر مجاہدین وقتاً فوقتاً انگریزوں پر چھاپہ مار کر انہیں نقصان پہنچاتے رہے جس سے انگریز حکومت بدحواس ہو گئی تھی اسلئے وہ پیر پاگارو پر کبھی دباؤ ڈالکر اور کبھی ان کی خوشامد کرکے مجاہدین سے نمٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

پیر سید شاہ مردان شاہ اوّل آپ اپنے بھائی سید علی گوہر شاہ ثانی

(جولا ولد تھے) کے انتقال کے بعد پیر پاگارو ہوئے اور ۱۸۹۶ء میں آپ نے مسندِ سجادگی کو زینت بخشی۔ اس وقت انگریزوں کی بعض غلط پالیسیوں اور اغیار کی اشتعال انگیز کارروائیوں کی وجہ سے حُر مجاہدین بہت مشتعل تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے کھپرو سانگھڑ اور شہداد پور کے تعلقوں میں انگریزوں کے خلاف زبردست قسم کی گوریلا جنگ چھیڑ دی۔ سرکاری تھانے اور دفاتر ان کا نشانہ ہوتے تھے۔ ان کے تابڑ توڑ اور اچانک حملوں کی وجہ سے پولیس میں بالخصوص ہراس پھیل گیا۔ سرکارِ انگریزی نے اپنی روائتی ڈپلومیسی، مکروفریب اور جاسوسی سے کام لیکر ان کی سب کمین گاہوں کا پتہ لگا لیا اور پولیس کی بھاری جمعیت کو ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے سندھ کے دوسرے علاقوں سے یہاں پہنچایا گیا۔ نیز فوج کو بھی پولیس کی مدد کے لئے بھیج دیا ——— اور بے شمار حُروں کو گرفتار کرکے ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا۔ بہت سے مارے گئے بہت کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ اور جن لوگوں نے جاسوسی وغیرہ کرکے یا کسی بھی دوسرے طریقے سے انگریزوں کی مدد کی تھی، ان کو انعامات سے نوازا گیا۔ حُروں کو ابنائے وطن سے سخت شکایت تھی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہمیں انگریزوں سے لڑنے دو۔ اور تم مزاحمت نہ کرو تاکہ ہم خود ہی ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹیں۔ بلکہ اگر تم ہماری مدد نہیں کرسکتے تو غیر جانبدار ہو جاؤ۔ پھر دیکھو ہم انگریزوں کو کیسے ناک چنے چبواتے ہیں۔ مگر حریص اور خوشامدی لوگ حُروں کے خیرخواہ بنکر ان میں گھُس جاتے اور ان کے راز لیکر غیر ملکی آقاؤں کو پہنچا دیتے جس کے عوض میں انہیں حقیر سا انعام مل جاتا اور اس پر بڑا فخر محسوس کرتے۔ حُروں کی یہ گوریلا جنگیں سخت خون آشام تھیں جن سے انگریز لرز اٹھے تھے مگر انہوں نے بھی موقعہ پاکر اس جمعیت کو کچلنے میں کوئی دریغ نہ کیا۔

موجودہ پیر پاگارہ کے دادا شمس العلماء حضرت پیر شاہ مردان شاہ اول (کوٹ دھنی)
رحمت اللہ علیہ کی شبیہہ مبارک

ان جنگوں میں ان کی مناسب رہنمائی نہ ہوسکی۔ ان کی شیرازہ بندی اور معاونت کا بھی خاطر خواہ بندوبست نہ ہوسکا۔ حالانکہ یہ ۱۸۹۸ء تک جاری ہیں اصل وجہ یہ تھی کہ ان ایام میں خود حضرت پیر سید شاہ مردان شاہ اول اپنے سجادگی کے مقدمات میں الجھے رہے اور بیم و یاس کی کشمکش میں وہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ نیز حروں کی جماعت بھی اس تذبذب میں تھی کہ احکام و ہدایات کس طرح حاصل کی جائیں۔ کیونکہ حالت مخدوش تھی۔

سیّد شاہ مردان شاہ اوّل کی سجادگی کا معاملہ

سید علی گوہر شاہ ثانی لاولد تھے اس لئے انہوں نے اپنے تیسرے بھائی شاہ مردان شاہ کو اپنا جانشین بنایا۔ لیکن شروع ہی سے آپ کے بڑے بھائی پیر علی مظفر شاہ نے سجادگی پر اپنا حق جتلانے کے لئے زبردست کشمکش کا آغاز کر دیا تھا۔ اور یہ معاملہ بالآخر کورٹ تک پہنچا جہاں کافی عرصہ تک کیس چلنے کے بعد دسمبر ۱۸۹۹ء میں اس کا فیصلہ سید شاہ مردان شاہ کے حق میں ہوا۔ اور مدعی پیر علی مظفر شاہ کا یہ دعویٰ مسترد ہوگیا کہ وہ ہی سجّادہ نشینی کے حقدار ہیں۔

چنانچہ آپ کا ایک خط مولف "لبّ تاریخ سندھ" نے نقل کیا ہے جو آپ نے اس سلسلے میں اسے لکھا تھا۔ جیسا بتایا گیا ہے کہ سجادگی کے تنازعہ کا مقدمہ ۲۲ دسمبر ۱۸۹۹ء کو خارج ہوگیا ہے اور مدعی کا دعویٰ رد کر دیا گیا ہے

سیّد شاہ مردان شاہ اوّل کا دور پُر آشوب

انگریزی حکومت کی گرفت سندھ پر نہایت مضبوط ہو چکی تھی اور پورا ہندوستان ان کے زیر اقتدار تھا۔ ہر قسم کی تحریکیں تقریباً مُردہ یا نیم مردہ ہو چکی تھیں۔ انگریزوں نے اپنا نظام حکومت اس عمدگی سے آراستہ

گیا تھا کہ برصغیر دہشت زدہ سا ہو گیا۔ ان کا محکمہ سراغ رسانی بہت مستعد تھا محکمہ مال گذاری کی بدولت ہر ضلع کا کونہ کونہ ان کی دسترس میں تھا۔ با اثر افراد اور امرا کو انہوں نے خطابات اور جاگیریں دیکر اپنا ممنون احسان بنا لیا تھا نوازشات کی یہ روش اسقدر جاذب نظر تھی کہ ہر کہہ و مہہ خوشامد۔ وفاداری اور چغلی کھانے کے سب طریقوں کو کام میں لاکر انگریزی سرکار کا منظورِ نظر بننا اپنا مقصدِ حیات سمجھتا تھا۔

فوج اور پولیس جگہ جگہ متعین تھی اور اہلِ وطن کے ساتھ ساتھ گورا فوج اور اہل کار وعمل دار اس انداز سے تعینات کئے جاتے تھے کہ ہندوستانیوں کی طرف سے ہر شورش کو بالکل آغاز میں ہی کچل دیا جائے۔ اس وسیع وعریض اور مضبوط حکومت کے مقابلے پر کھڑا ہونا کوئی آسان بات نہ تھی کیونکہ ابھی تک ذہنی شعور آزادی کی بجائے غلامی سے ہی مرعوب تھا۔ ان حالات میں حُروں کا زندہ رہنا ہی ان کی جوانمردی اور حُریت کی حرارت کا ثبوت ہے۔

حضرت سید شاہ مردان شاہ کو سجادگی بڑے پر آشوب حالات میں نصیب ہوئی تھی۔ اور خاندانی تنازعہ اس پر مستزاد تھا۔ اس لیئے وہ اس تحریک کی خاطر خواہ ـــــ آبیاری نہ کر سکے۔ ادھر حُروں کے مختلف طائفے اپنے حالات اور سیاسی کشمکش کی وجہ سے بارہا انگریزی حکومت سے ٹکرا گئے سنہ ۱۸۹۵ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک کے دوران ان کی یہ گوریلا جنگیں اسقدر پریشان کن اور خوفناک تھیں کہ انگریزوں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ عوام گھبرا اٹھے تھے۔ اور حضرت پیر پاگارو پر حکومت کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ لہٰذا مصلحت وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس شدت کو کم کیا جائے۔ کیونکہ اب تحریک کی بقا کا سوال درپیش تھا۔ اگر ذرا سی لغزش ہو جاتی تو اس کا قوی امکان تھا کہ حُر مجاہدین ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیئے جاتے

اور حضرت پیر پاگارو کو بھی ناگفتہ بہ حالات سے گذرنا پڑتا۔

ان ہی ایام میں بچو فقیر نے نمایاں طور پر زبردست قسم کے چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ جن کی وجہ سے سانگھڑ اور تھر پارکر کے علاقوں میں خوف وہراس پھیل گیا اور حکومت کی مشنری بڑے شدومد سے ان کے استیصال کے لئے حرکت میں آگئی۔

بچو کی ناکامی

۱۸۹۶ء میں جبکہ آنریبل مسٹر جیمس دوبارہ سندھ کا کمشنر بن کر آیا تھا۔ حُروں نے بچو فقیر کی سرکردگی میں گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور نہایت ہی قلیل عرصے میں اسقدر کامیابیاں حاصل کرلیں کہ انگریز سرکار انگشت بدنداں رہ گئی۔ پولیس کے دستے ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تو ملٹری کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن سانگھڑ اور تھرپارکر اضلاع کے مختلف تعلقوں میں حُروں نے اس مضبوطی سے اپنے قدم جمالئے تھے کہ بظاہر ان کی شکست کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیونکہ یہ جگہیں گھنے جنگلات کی وجہ سے ان کے لئے بہترین کمین گاہیں ثابت ہوئیں۔ ان کے اندر گھستے ہوئے ملٹری اور پولیس کے جوان دہشت زدہ سے ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ہر قدم پر انہیں گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور جب سرکاری افواج کے حملوں میں شدت آجاتی تو حُر مجاہدین اپنی کمین گاہوں میں پناہ لیتے۔ اس طرح حکومت کا ناک میں دم آگیا تھا۔ اب انگریزوں نے اپنے نظام جاسوسی کو زیادہ کارآمد بنانے کے لئے مختلف جاسوسوں کو حُروں کے بھیس میں ان کمین گاہوں کی طرف روانہ کیا جو بھیج پاگارو کے نعرے لگاتے ہوئے مختلف اوقات اور اطراف سے بچو کے ساتھیوں سے مل گئے اور نہایت منافقت سے ان میں گھل مل گئے۔ جب بہت سے سربستہ رازوں سے واقف ہو گئے تو حکومت کو تمام کوائف سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ ان

خبروں کی روشنی میں حروں کی کمین گاہوں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اور ان پر بم باری شروع کر دی جس سے جنگلات تباہ اور مورچے برباد ہو گئے اور بے شمار مجاہدین موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس بمباری نے حروں کو چھپنے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

ادھر حضرت پیر پاگارو کو بھی نہایت دق کیا گیا اور ان پر حروں کی سرگرمیاں بند کروانے کیلئے زبردست دباؤ ڈالا گیا۔ پیر صاحب خود حالات کی ناسازگاری اور اپنے ملکی باشندوں کی اقتدار پرستی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسلئے پیر صاحب نے حروں کو معرکہ آرائی سے گریز کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ پیر صاحب کی ہدایت پر حروں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں ان حالات کو غنیمت سمجھکر حروں پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انکی مثال پھر ۱۹۴۳ء ہی میں ملتی ہے کئی خاندان تباہ ہو گئے بے شمار لوگ پھانسی پر چڑھا دیئے گئے اور جس کسی پر حر ہونے کا شبہ ہوا اسے فوراً گولی ماری گئی۔ انگریزوں نے جس طرح ۱۸۵۷ء میں دہلی میں انقلابیوں پر ہر ظلم و ستم روا رکھا تھا۔ بعینہ یہ سلوک یہاں بھی کیا گیا۔ ان کی خونچکاں داستانیں زیب قرطاس نہ ہو سکیں۔ کیونکہ اس قدر ظالم اور جابر لیکن مضبوط اور وسیع سلطنت کے مخالفین کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں شامل کرنا بڑے دل گردے کی بات۔ بلکہ خود کو معتوب کرنے کے مترادف تھا۔ اس لئے بچو فقیر اور اس کے ہمراہیوں کے کارنامے صرف دلوں اور دماغوں میں محفوظ رہ گئے اور وہ بھی استبداد زمانہ کے ہاتھوں موجودہ نسل تک پہنچتے پہنچتے تقریباً معدوم ہو گئے یا انہیں رہزنوں کی داستانوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ افسوس ہے ۱۹۴۷ء کے بعد بھی اس موضوع پر کسی درد مند ادیب نے قلم نہیں اٹھایا۔

بچو فقیر اور لُبِّ تاریخ سندھ

مولف اپنے روایتی عناد اور انگریز پرستی کی وجہ سے اسلئے اس میں بھی نہایت حقارت سے لکھتا ہے۔

بخوؔ بادشاہ کی متوازی حکومت کے وزیرِ اعظم پیرو اور دوسرے پانچ وزرا کے مزارات جن کو انگریزوں نے شہید کیا واقع سانگھڑ

۱- (دائیں سے بائیں) تگیوچانگ، پیر بخش وسان، گلومچی" ۲- (دائیں سے بائیں) مصری گاہو، عثمان سنگوردو، بچاؤ گاہو-

"۱۸۹۶ء میں سرکار نے بچو موچی کو جو حروں (لڑوں) کا سرگروہ ہے۔ ضلع تھرپارکر کے شہر سانگھڑ میں گرفتار کرلیا ہے۔ اس لئے شادی پلی میں دربار منعقد کیا گیا۔ اور پولیس اور دوسرے محکموں کے کئی عملداروں کو جنہوں نے ان شریروں کے فتنہ کو فرد کرنے میں سرکار کی اعانت کی تھی۔ تلواریں اور لنگیاں بطور انعام پیش کیں۔ نیز پیر پاگارو کو اس سلسلہ میں ان کی خدمات کے عوض شمس العلماء کا خطاب دیا گیا"

شارح کا فٹ نوٹ

اس تحریر کی تشریح میں جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ مولف نے بچو کو موچی لکھا ہے۔ حالانکہ وہ خاصخیلی تھا۔ جس کا ایک ساتھی گلو تھا۔ حروں کی انگریزی سرکار کے خلاف یہ دوسری مہم ۱۸۹۵-۹۶ء میں گیارہ سالاروں کی رہنمائی میں شروع کی گئی تھی ان میں سے آٹھ کے نام مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ بچو خاصخیلی جس کا لقب بادشاہ تھا یعنی بچو بادشاہ۔

۲۔ پیر بخش وسان جس کا لقب وزیر تھا۔

۳۔ گلو موچی ۴۔ تگیہ چانگ

۵۔ بھلو گاہو ۶۔ خمیسہ وسان

۷۔ ختلہ قاضی ۸۔ تلاں قصائی "

۱۸۹۸ء میں بھی حروں نے ایک بار پھر گوریلا جنگ شروع کردی تھی مگر حضرت پیر پاگارو کے حکم سے جلد ہی اس کا خاتمہ ہوگیا۔ یوں تو اس کے بعد وقتاً فوقتاً چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ مگر مذکورہ جنگیں بڑے پیمانے پر ہوئی تھیں۔ دراصل حروں کے نزدیک انگریز کا وجود اس سرزمین

کے لیئے کوڑھ کی حیثیت رکھنا تھا جسے وہ جلد از جلد دور کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ وہ اُن کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیئے تیار رہیں۔ اگرچہ مرشد کے حکم سے انہیں جنگ بھی بند کرنی پڑتی تھی مگر ان کا جذبۂ جہاد انہیں بے چین رکھتا تھا۔ اور ذرا سا اشتعال پیدا ہونے پر بے دریغ حکومت سے ٹکرا جاتے تھے۔ آپ ذرا غور کریں۔ اتنی بڑی سلطنت سے متواتر ایک صدی تک ٹکراتے رہنا کس قدر بہادری اور استقامت و عزیمت کی بات ہے افسوس ہے کہ تاریخ کے تذکروں میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ہم ایسے مجاہدوں کی روح کو سلام کہتے ہیں۔ جنہوں نے آزادی کے لیئے اپنی جانیں قربان کیں اور آنے والوں کے لیئے ایسے نقوش چھوڑ گئے جن پر چل کر ۱۹۴۷ء میں قوم حقیقی آزادی سے ہمکنار ہوئی۔ ہم ان بزرگوں کی روحوں کو بھی سلام کرتے ہیں جنہوں نے یہ بیج بویا۔ اسکی آبیاری کی اور ہمیں آزادی و حریت کی داستانوں کا قیمتی سرمایہ عطا کیا

حضرت سیّد صبغت اللہ شاہ ثانی اور سندھ کا تاریخی اور سیاسی پس منظر

حضرت سید شاہ مردان شاہ اول کا انتقال ۷ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ بمطابق ۹ نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اور آپ کے بعد حضرت سیّد صبغت اللہ شاہ ثانی نے مسند خلافت کو زینت بخشی۔ ہم آگے بڑھنے سے پیشتر وہ سیاسی پس منظر پیش کرنا چاہتے ہیں جو حضرت کی سجادگی کے وقت موجود تھا۔ تاکہ آنے والے واقعات کی اہمیت کا اندازہ لگانا زیادہ آسان ہو۔

پہلی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء کی اس جنگ عظیم میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے حکومت کی امداد کا اعلان کر دیا۔ اور ہندوستانیوں نے دل کھول کر فوج اور روپے

سے انگریزوں کی مدد کی۔ ہندوستانی فوجوں نے بصرہ بغداد اور قط العمارہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی فوج نے فلسطین میں داخل ہو کر بیت المقدس حلب اور موصل بھی فتح کر لئے۔ جس وقت جرمنی کا فوجی سیلاب بڑی تیزی کے ساتھ بلجیم کو پامال کرتا ہوا پیرس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسوقت بھی ہندوستانی فوجوں نے ہی اس پیش قدمی کو روکا۔ عرب اور مصر میں بھی ہندوستانی افواج نے قیمتی خدمات سرانجام دیں۔

آخر اس جنگ میں جرمنی اور ترکی کو شکست ہوئی اور ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو دن کے گیارہ بجے عارضی صلح کا اعلان ہو گیا۔ اور یہ تباہ کن جنگ ختم ہو گئی۔

اس جنگ کا اثر برصغیر ہند و پاکستان پر بھی ہوا۔ ہندوستانی فوجیں اس جنگ میں انگریزوں کی حمایت میں شامل تھیں۔ ملک میں قحط کے سے آثار پیدا ہو گئے طاعون اور ایسی ہی کئی مہلک بیماریوں کی وجہ سے ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے ایک طرف عوام پریشانی اور کرب میں مبتلا تھے۔ دوسری طرف انگریزوں کے ٹوڈی اس حکومت کی جڑیں استوار کرنے کے بدلے خان بہادر، رائے صاحب اور سر کے خطابات حاصل کرنے میں پیش پیش تھے۔ لیکن یہ ملک سیاسی شعور اور آزادی کی لگن سے بالکل محروم نہ تھا۔ بلکہ کانگریس، مسلم لیگ، جمعیتہ العلمائے ہند اور تحریک خلافت وغیرہ جیسی منظم اور فعال تحریکیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ جن کا ذکر ہم مناسب مقام پر کریں گے۔

جنگ کے دوران انگریزوں کو حُروں سے ہر وقت خطرہ تھا۔ مبادا سندھ میں آزادی کی جنگ چھڑ جائے۔ لیکن چونکہ حضرت شاہ مردان شاہ اول پر انگریزوں کا دباؤ برابر قائم تھا۔ اس لئے موقع مناسب نہ پا کر انہوں نے جلد بازی سے گریز کرنے میں ہی مصلحت سمجھی اس وقت حُروں کی بربادی کے سامان بدستور سرگرم عمل تھے

کیونکہ بجّو بادشاہ کی آزاد حکومت کے بچے کھچے آثار ابھی تک موجود تھے۔ جناب قاضی محمد اکبر صاحب اپنے ایک مضمون مطبوعہ "جنگ" کراچی کے شمارہ مورخہ ۲۳راپریل ۱۹۶۸ء میں رقمطراز ہیں:۔

"حُر جماعت میں بھی دو حصے تھے۔ ایک سالم دوسرے فرقی۔ فرقی حصّہ خود کو الگ اور مخصوص سمجھتا تھا۔ اور امیر کے گویا فدائی تھے۔ پیر صبغت اللہ شاہ اول اس جماعت کے بانی خود ایک تقدس مآب بزرگ تھے۔ اور ہر اعتبار سے انہیں ہمہ صفت موصوف کہا جاسکتا تھا۔ حُر جماعت اپنے دونوں فرقوں۔ سالم اور فرقی ۔ کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔ اگرچہ کفر نے اس کو مٹانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ سندھ کی حُر جماعت نے پنجاب میں سکھوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے دَور میں سندھ کو اس سے بڑی کامیابی کے ساتھ محفوظ رکھا۔ اس تحفظ کے لئے حُروں نے سکھوں سے جہاد بھی کیا اور وہ اس کے لئے بھی تیار تھے کہ سرحد اور پنجاب کو سکھوں کی زیادتیوں سے نجات دلانے کے لئے جہاد میں شریک ہوں مگر سید احمد شہیدؒ نے ان کو وہاں طلب نہیں کیا۔ سکھوں کے بعد انگریزوں کا زمانہ آ نے تک کے عرصہ میں حضرت پیر صبغت اللہ شاہ حُروں کو دینی تعلیم سے مزیّن کرتے رہے۔ پیر صاحب متقی اور پرہیزگار رہنما تھے اور حُروں کو بھی اُنہوں نے عبادت گذار اور عامل دین بنانے کی کامیاب سعی کی۔ لیکن انگریز ہمیشہ ان کو اور حُر جماعت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے رہتے۔ جلد ہی ان کا شک عتاب میں تبدیل ہوگیا۔ اور عتاب نے سختیوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس صورت حال نے حُروں کو جنگ پر مجبور کر دیا۔ انگریزوں کے خلاف حروں نے پہلی

بغاوت ۱۸۹۶ء میں کی۔ اس طرح کہ ایک حُر نے جو بچو بادشاہ کہلاتے تھے اپنے ساتھی پیرو کے ساتھ ملکر آزاد حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ باغی یا متوازی حکومت بارہ برس تک قائم رہی اور اس جنگ کے دوران انگریز حُروں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے رہے۔ صرف ظلم ڈھانے کے الفاظ سے ان زیادتیوں کی تشریح نہیں ہوسکتی جو انگریزوں نے حُروں پر روا رکھے۔ ہزاروں کی تعداد میں حُر گرفتار کر کے جیلوں میں بند کیئے گئے اور مقدمات چلائے بغیر انکو ناکردہ گناہوں کی سزائیں دی گئیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں پھانسی پر لٹکائے گئے۔ قید و بند کے اس سلسلے نے حُروں کی بغاوت میں کمی کرنے کی بجائے اضافہ ہی کیا اور ہر ظالمانہ اقدام انگریز کے خلاف نفرت بڑھانے کا باعث بنتا رہا ان کی زرعی اراضیاں ضبط کر لی گئیں۔ بات بات پر جرمانے عاید کیئے گئے۔ حد یہ ہے کہ جب جیلوں میں جگہ نہ رہی تو خاردار تاروں کی باڑھ بنا کر ان میں لاتعداد حُروں کو پابند سلاسل کیا گیا۔ حُروں کے دوسرے پیر صبغت اللہ شاہ ثانی کے مسند نشین ہونے پر صورتِ حال اور سنگین ہوگئی"۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوگیا ہے۔ کہ جب حضرت پیر صبغت اللہ شاہ ثانی مسند نشین ہوئے۔ اسوقت یہ خلافت کانٹوں کا تاج رکھنے کے مترادف تھی۔ محترم جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

"حُر جماعت کے ہر تندرست آدمی کو خاردار باڑھوں میں بند کر دیا گیا اور طاقتوروں کو ضلع احمد نگر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت شاہ مردان شاہ اول نے انگریزوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۱۴ء

والی جنگ میں آپ نے انگریزوں کو پانچ سولڑا کا سپاہی بھی دیئے۔ مالی مدد بھی کی۔ پھر کہیں ان باڑھوں کا خاتمہ ہوا۔ اس کے باوجود انگریزوں نے اس گدی کو نگاہ میں رکھا اور اس جماعت اور اس کے سربراہ پر بے حد تشدد کیا گیا"

بناکردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

موجودہ پیر پاگارہ کے والد بزرگوار شہید حق و صداقت حضرت پیر صبغت اللہ شاہ ثانی

(پگ دھنی) رحمت اللہ علیہ کی شبیہ مبارک

باب پنجم

شہید حق و صداقت

حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی شہیدؒ

آپ اپنے والد کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں تقریباً بارہ سال کی عمر میں مسند نشین ہو کر پیر پاگارو ہوئے۔ آپ کا لقب "پگ دھنی" ہے۔ آپ کے ابتدائی حالات پر اخفا کا پردہ اس لئے پڑا ہوا ہے کہ جابر انگریز حکمرانوں کے خوف سے کوئی بھی ان کے مخالفین کا تذکرہ علی الاعلان کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا اور اخبارات تو گویا انگریز سرکار کے لطف و کرم سے زندہ تھے۔ اس سلسلے میں محترم جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب سہ ماہی "مہران" حیدر آباد کے نمبر ۳ اور ۴ سال ۱۹۵۶ء میں حضرت شہید کی سوانح حیات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

" سندھ کے اس مرد جری کی شخصیت اور کردار پر انگریز حکومت کے یکطرفہ پروپیگنڈا نے جو پردے چڑھا رکھے ہیں۔ ان کی دبیز تہوں میں سے صرف وطن پرست نگاہیں ہی حقیقت تک پہنچ سکتی ہیں۔ انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پلنے اور شائع ہونے والے اخبار اور رسالے اس "باغی" کے خلاف جو کچھ لکھنا چاہیئے تھا جی کھول کر لکھتے رہے۔ اور اس سلسلے میں آنے والوں کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ دوسری طرف اس شیر جری کے ابتدائی حالات ویسے بھی کہیں دستیاب نہیں ہو سکے۔ جن سے آپ کی شخصیت اور عزائم کا پورا پورا علم ہوتا۔ ہاں آپ کے خاندانی ماحول

کے پیش نظر بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے"۔

آزادی کی تڑپ آپ کو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ آپ کی پیدائش ۱۳ صفر ۱۳۲۷ھ میں ہوئی چونکہ مسند نشینی کے وقت آپ کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ اس لئے آپ کے اہل خاندان اور دوسرے لوگوں کو یہ امید نہ تھی کہ آپ اتنی بڑی جماعت کی تنظیم برقرار رکھ سکیں گے۔ اور مجبوراً ان سے صلاح و مشورہ کریں گے۔ انگریز کے پٹھو اس فکر میں تھے کہ آپ کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ انگریزوں کے وفادار کی حیثیت سے رہیں۔ درگاہ کے دوسرے خدمت گار اپنا اثر و رسوخ جمانے کا سوچ رہے تھے۔ لیکن حضرت شہیدؒ شروع سے ہی جرأت مند اور مستحکم ارادے کے مالک تھے اور کسی صورت میں بھی دوسروں کے دباؤ کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے اس لئے آپ کے مضبوط اقدام دیکھکر مفاد پرستوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے خلاف دھڑے بندی کا آغاز ہو گیا اور آپ کے کئی قریبی عزیز انگریز حکومت کے کارپردازوں سے ملکر آپ کو زک پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

روایت ہے کہ آپ نے لڑکپن میں ہی جب کہ آپ پیر پاگارو بن چکے تھے اپنے چچا مرحوم پیر علی گوہر شاہ کے نام پر انگریزوں کا دیا ہوا ایک "آفرین نامہ" بنگلے کی دیوار پر آویزاں دیکھکر کہا تھا:۔

"ہمارے بزرگ بھی کسقدر سادہ لوح تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ان کو بڑی عزت بخشی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ آفرین نامہ موجود ہے"

اور اس کے بعد فریم توڑ کر آفرین نامہ پرزہ پرزہ کر دیا۔ یہ آپ کی خودداری۔ عزتِ نفس۔ حریت پسندی اور خاندانی وجاہت کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریز کی اس حکومت کا آفرین نامہ ایک نوجوان شخص پرزہ پرزہ کر رہا ہے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ تو اس نوجوان کی عظمت کے سامنے ہمارا سر احترام

سے جھک جاتا ہے۔

آپ کے نہایت قریبی عزیز و اقارب جنھیں آپ پر اثر ڈالنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ انتقام لینے اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس قسم کے ہر واقعہ کی خبر حکومت تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ بھی جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا انگریزی حکومت پہلے ہی آپ کی ساری کارروائیوں کو مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ نوجوان مجاہد ہمارے سامنے کسی بھی حالت میں سر تسلیم خم نہ کرے گا۔ بلکہ ہماری حکومت کے خلاف کبھی نہ کبھی اُٹھ کھڑا ہوگا۔ انہوں نے ہر ایسے واقعہ کا سختی سے نوٹس لینا شروع کر دیا جس میں پیر صاحب کے آئندہ عزائم کی جھلک نظر آتی ہو۔ حاسدوں نے لگائی بجھائی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن سب سے زیادہ نقصان ان اپنوں سے پہنچا جو آپ کے خلاف انگریز کے مخبر اور گواہ بن گئے تھے۔ انگریز نے آپ کو موقع پاکر گرفتار کر لیا۔ اور نام نہاد مقدمہ چلانے کا اعلان کر دیا۔ یہ کیس سکھر کی عدالت میں رجسٹر ہوا اور باقاعدہ کارروائی شروع ہوگئی۔ آپ کے اس مقدمہ کی پیروی کے لئے قائدِ اعظم محمد علی جناح تشریف لائے جو اس وقت بیرسٹر جناح کے نام سے مشہور تھے۔ انہیں حکومت نے راز میں لیکر اپنا عندیہ بتا دیا کہ حکومت ہر حال میں پیر صاحب کو سزا دیگی لیکن مسٹر جناح نے اس کا نوٹس لئے بغیر مقدمہ کی پیروی کی اور باقاعدہ کورٹ میں آنے لگے۔ مگر جب دیکھا کہ جج دھاندلی کر رہا ہے اور قانون کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں تو بطور احتجاج آپ کورٹ سے چلے گئے اور حکومت نے پیر صاحب کو دس سال قید کی سزا دیکر سندھ سے دُور ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رکھنے کا حکم دے دیا آپ کو پونا اور رتناگری جیلوں میں زیادہ عرصہ تک رکھا گیا۔

آپ نے رتناگری جیل میں اپنے جدِ امجد حضرت سید محمد راشد المعروف بہ روضے دھنی کے ملفوظات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ اردو۔ فارسی۔ سندھی کی دوسری

کئی بہترین کتابوں کو نہایت عرق ریزی سے پڑھا اور اپنے ہندو نصائح کا ایک مجموعہ تیار کیا جس کا ذکر ہم مناسب جگہ پر کریں گے۔ پھر جب رتناگری جیل سے آپ کو مدنا پور کی مرکزی جیل میں منتقل کیا گیا تو وہاں انکی ہندوستان کے کئی سیاسی لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ جس کے بعد آپ نے ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا پورے غور و خوض کے ساتھ مشاہدہ کیا اور اس کے عوامل و اسباب، طریقہ کار اور عواقب و نتائج پر غور و فکر کرتے رہے۔ اور انگریز کو بزور شمشیر ہندوستان سے نکالنے کا لائحہ عمل مرتب کیا۔ دوسرے سیاسی لیڈروں کی ملاقاتوں نے اس جذبہ کی آبیاری کی، چونکہ وہ سب لیڈر شمع آزادی کے پروانے تھے۔ اور اسی جرم کی سزا میں پیر صاحب کی طرح جیلوں میں بند تھے۔ اس لیئے پیر صاحب ان کے حالات سُنکر انگریز سے اور زیادہ متنفر ہوتے چلے گئے۔

برصغیر کی سیاسی حالت

تحریک ہوم رول۔ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی تھی۔ اس لیئے ملک کی سیاسی جماعتوں کا متفقہ مطالبہ تھا کہ ان خدمات کے صلے میں ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ لیکن انگریز ٹال مٹول کر رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسز اینی بیسنٹ نے ملک میں سول تحریک کا آغاز کیا۔ قائد اعظم اس تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ حکومت نے مسز اینی بیسنٹ کو گرفتار کر لیا اور سختی سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ اس موقعہ پر بڑے بڑے بہادر لیڈروں کے جی چھوٹ گئے مگر قائد اعظم کو کوئی دھمکی بھی انکی راہ سے نہ ہٹا سکی۔ آپ نے اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے ہوم رول تحریک میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس زمانہ میں آپ نے سر ڈنشا کی بیٹی رتن بائی سے شادی کی اور لارڈ ولنگڈن گورنر بمبئی کی الوداعی پارٹی کو ناکام بنایا ہندوستان میں تحریک آزادی کے سیلاب کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر مسٹر مانٹیگو

حضرت پیر سائیں صبغت اللہ شاہ شہید رحمت اللہ علیہ کی وہ شبیہ مبارک جب کہ
آپ بارہ سال کی عمر میں سجادہ نشین ہوئے

وزیر ہند کو اعلان کرنا پڑا کہ ہم آہستہ آہستہ تمام اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے اور لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کے ساتھ مل کر ایک رپورٹ تیار کی جسے ۱۹۱۸ء میں برٹش پارلیمنٹ نے منظور کر لیا یہ سفارشات ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے نام سے مشہور ہیں۔

رولٹ ایکٹ:۔ یہ سفارشات چونکہ ہندوستانیوں کے مطالبات سے بہت کم تھیں اسلئے انہوں نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہی ایام میں جب کہ اصلاحات کے خلاف آواز بلند کی جا رہی تھی۔ حکومت نے رولٹ ایکٹ منظور کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ تحریک آزادی میں حصہ لینے والوں کو سنگین سزائیں دی جا سکیں۔ اس پر ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ لوگوں نے سرکاری عمارات کو جلا دیا۔ کئی انگریز مارے گئے۔ امرتسر میں عوام نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بنک جلا دیئے گئے اور سامان لوٹ لیا گیا۔ پنجاب میں ہر جگہ اودھم مچا ہوا تھا۔ مگر امرتسر اس تحریک کا مرکز تھا۔ حکومت نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا جس سے عوام میں بے حد رنج و غصہ اور ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا۔ حکومت کے اس اقدام کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں بکثرت ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر جنرل ڈائر کے حکم سے اس مجمع پر گولی چلا دی گئی۔ جس سے سینکڑوں لوگ ہلاک و مجروح ہوئے اور صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

تحریک خلافت و ہجرت:۔ انہی ایام میں جہاں انگریزوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ خلافیاں کیں۔ وہاں اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے اسلامی ممالک کی وحدت کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ جرمنی کی شکست کے ساتھ ترکوں کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا اس موقعہ پر انگلستان کے وزیر اعظم لائیڈ جارج نے صلح کے لئے ترکوں کے سامنے

ذلت آمیز شرائط پیش کیں جسکی وجہ سے اسلامی ممالک میں انگریزوں کے خلاف شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اس رویے کے خلاف تحریک شروع ہوئی مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی اس تحریک کے روح رواں تھے تحریک خلافت نے ہندوستان کے لوگوں میں جرأت، بہادری و ذمہ داری کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اس موقعہ پر گاندھی جی نے ان کی حمایت کی۔ یہ عدم تعاون اور ترک موالات کا زمانہ تھا۔ جس کے باعث دونوں قوموں نے مشترک طور پر اس جدوجہد کو جاری کیا۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہندوستانی جیلوں میں چلے گئے۔ متعدد مقامات پر پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ گولی بھی چلانی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں نوجوان آزادی پر قربان ہو گئے۔ اس تحریک میں مسلمانوں کا کردار سب سے بلند تھا۔ انہوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑیں تعلیم کو خیر باد کہا۔ قائد اعظم کو ان چیزوں سے اتفاق نہ تھا۔ اور انہوں نے انجام سے بے پرواہ ہو کر علی الاعلان ان کی مخالفت کی۔ وہ آزادی کے حصول میں ہر قربانی دینے کو تیار تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں اور تعلیم کو ہی ترک کر دیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید مرحوم کی کوششوں کے باوجود مسلمان اپنی ہمسایہ قوم سے تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں بہت پیچھے رہ گئے اور آج ہم محسوس کرتے ہیں کہ قائد اعظم نے کس قدر صحیح سوچا تھا صرف یہی نہیں بلکہ علما نے جہاں انگریزی تعلیم اور سرکاری ملازمت کے خلاف فتوے دیئے وہاں ہندؤں کی چالوں میں آکر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کر جانے کا فتوے بھی دیدیا۔ قائد اعظم نے اس تحریک کی شدید مخالفت کی۔ اگرچہ قوم نے ہنگامی جوش میں آکر قائد اعظم کی ایک نہ سُنی لیکن آپ مخالفت کے اس تند سیلاب میں بھی ایک مضبوط چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ آخر حالات نے ثابت کر دیا کہ قائد اعظم کا نظریہ ہی صحیح اور درست تھا۔ لیکن اس ہنگامی جوش

کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی جائدادیں اونے پونے ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کر دیں اور ہندوستان چھوڑ کر افغانستان چلے گئے۔ وہاں کسی نے انہیں مُنہ تک نہ لگایا۔ آخر مصیبتیں اور مشکلیں برداشت کرتے ہوئے پھر ہندوستان لوٹ آئے مگر اس عرصہ میں لکھ پتی لوگ بھی کنگال ہو چکے تھے۔ اس طرح ان تحریکوں نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔

تحریک ترک موالات کے متعلق قائد اعظم کے خیالات یہ تھے کہ گاندھی جی کا وضع کردہ پروگرام ملک کو غلط راستے پر لے جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا:-

"اگر گاندھی کا پروگرام ملک کو آزادی کی منزل پر لیجانے والا ہوتا تو سب سے پہلے میں اس تحریک میں شامل ہوتا۔"

آپ نے تعلیمی اداروں کے مقاطعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارے نوجوان تعلیم کو چھوڑ کر کیا کریں گے میں نے اس سلسلے میں بہت سے دوستوں سے گفتگو کی ہے مگر مجھے کوئی بھی اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ صرف یہی کہا گیا کہ گاندھی جی کا حکم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی طاقت کی ضرورت ہے اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ اسکولوں کو چھوڑ کر چرخہ کاتا کرو۔ ترک موالات اور عدم تشدد کے نظریات کامیاب ہو گئے تو یہ معجزہ سے کم نہ ہو گا۔"

سندھ کی بمبئی سے علیحدگی

برصغیر کے مخصوص سیاسی حالات کے علاوہ سندھ میں بمبئی سے علیحدگی کی تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ بمبئی سے سندھ کی وابستگی ہندو اور انگریز کی چال تھی تاکہ سندھ کی مسلم اکثریت ہندو اقلیت کی غلام بن جائے لیکن جوں جوں سیاسی شعور

بیدار ہوتا گیا سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ بھی زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۲ء میں سندھ کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس بڑے پیمانہ پر کراچی میں منعقد ہوا۔ جس نے فیصلہ کیا کہ مسلمانان ہند کی طرف سے سندھ کی صوبائی خود مختاری کا پُر زور مطالبہ کیا جائے اور اسی غرض سے "یوم سندھ آزاد" منایا جائے۔ ہر جگہ سندھ آزاد جماعت قائم کی جائے اور نومبر ۱۹۳۲ء میں ایک عظیم نمائندہ کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس کانفرنس کے انتظام کے لئے سید میران محمد شاہ کو سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس فیصلہ سے قبل عبدالمجید سندھی نے روزنامہ الوحید کے ذریعہ سندھ آزاد جماعت کی تحریک شروع کی۔ ستمبر ۱۹۳۲ء میں سندھ میں یوم سندھ آزاد منایا گیا۔ اور ۱۵، ۱۶ نومبر ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں ایک عظیم سندھ آزاد کانفرنس نے سندھ کی علیحدگی کی بابت قرارداد پاس کی اور اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق کے بارے میں مسلمانوں کی طرف سے یقین دلایا گیا۔ کانفرنس نے ایک ورکنگ کمیٹی تشکیل دی جس میں تمام ضلعوں کو نمائندگی دی گئی۔ اور سر شاہنواز کو اس کا عارضی صدر۔ مسٹر ایوب کھوڑو کو نائب صدر اور سید میران محمد شاہ کو سکریٹری نامزد کیا گیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو سندھ ہندو کانفرنس نے وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے پر سندھ کی علیحدگی کی بابت سخت اعتراضات کئے اور سندھ میں زبردست ایجی ٹیشن شروع کی۔

دوسری سندھ آزاد کانفرنس ۲۸، ۲۹ جولائی ۱۹۳۴ء کو کراچی میں زیر صدارت سر غلام حسین ہدایت اللہ منعقد ہوئی۔ جس میں دوبارہ سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ کیا گیا۔ اور سندھ کے ہندوؤں کو اس بات کی ضمانت دی گئی کہ مسلمان ان کی قطعاً حق تلفی نہ کریں گے اس کانفرنس نے سر شاہنواز کی جگہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو صدر۔ ایوب کھوڑو کو نائب صدر۔ سید میران محمد شاہ کو سکریٹری

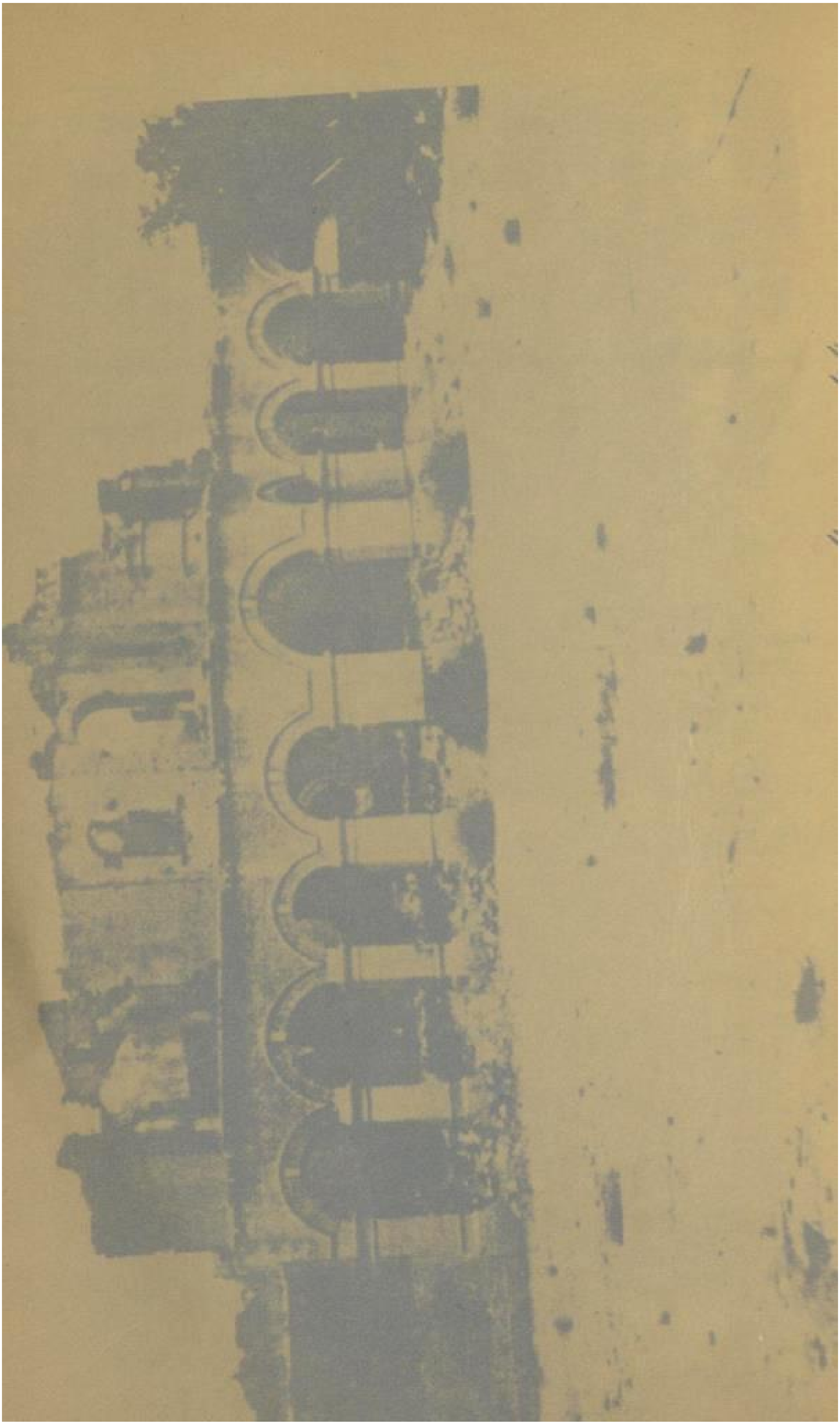

نامزد کیا۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی جس میں سندھ کی علیحدگی کی سفارش کی گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پارلیمنٹ میں پیش ہوا جس کی رُو سے شق نمبر ۴۶ کے تحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ تسلیم کیا گیا۔ ایکٹ پاس ہونے کے بعد اب سندھ کی علیحدگی کی تاریخ مقرر ہونا باقی تھی آخر کار ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء کو یہ آرڈر کونسل کے مسودے کی شکل میں ظاہر ہوا جس کی رُو سے اپریل ۱۹۳۶ء سے سندھ کو ایک دائمی خود مختار صوبہ تسلیم کیا گیا علیحدگی سے قبل کمشنر گبسن کا تبادلہ ہو گیا اور اسکی جگہ سر لانسیلاٹ گراہم سندھ کا پہلا گورنر مقرر ہوا۔

صوبہ سندھ اور تحریک آزادئ پاکستان

سندھ صوبائی اسمبلی کے پہلے انتخابات ۱۹۳۷ء کو منعقد ہوئے جمہوری اصولوں کے خلاف گورنر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ حالانکہ ان کے حامی ممبروں کی تعداد صرف چار تھی لیکن انہوں نے ہندوؤں کو ایک وزارت اور اسپیکر اسمبلی کے عہدے کا لالچ دیکر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اور اس طرح سندھ میں پہلی وزارت کی بنا پڑی۔ دوسری طرف اتحاد پارٹی کے ممبر جن میں ہندو بھی شامل تھے۔ مخالف بنچوں پر بیٹھے اس عرصہ میں سر غلام حسین کے ہندو ممبروں میں آزاد ہندو گروپ کے وزیر مکھی گوبند رام نے استعفے دیدیا۔ ان کی جگہ سر غلام حسین نے ہندو گروپ کی خواہش کے خلاف ڈاکٹر ہیمنداس کو وزیر مقرر کیا۔ اس اثنا میں اسپیکر اسمبلی بھوج سنگھ کے انتقال کی وجہ سے سید میران محمد شاہ سندھ اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہوئے اس پر ہندو ممبر سر غلام حسین ہدایت اللہ کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے اپنی وزارت بچانے کے لئے وزیروں کی تعداد کو بڑھانا چاہا جس پر گورنر راضی نہ ہوا۔ نتیجۃً یہ وزارت ٹوٹ گئی۔

سر غلام حسین کی جگہ خان بہادر اللہ بخش نے اتحاد پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے کانگریس ہندو گروپ کے اشتراک سے وزارت بنائی جس نے ۲۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو حلف اٹھایا۔ اس گروپ نے کانگریس کے تعمیری پروگرام کے پیش نظر شرکت کی تھی۔ اس کے بارے میں یہ بات زبان زد خلائق تھی۔ کہ اس وزارت کا دماغ خان بہادر اللہ بخش۔ دل پیر الٰہی بخش اور زبان نیچل داس ہے۔ لیکن یہ تینوں اکھٹے کام نہ کر سکے۔ اللہ بخش نے وزیروں کی تعداد بڑھانی چاہی جس پر آپس میں پارٹی بازی کی وجہ سے اختلاف ہوگیا۔

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی جس میں قائداعظم۔ سر سکندر حیات۔ مولوی فضل الحق اور دیگر کئی مسلم لیگی زعمائے شرکت کی اور اس طرح سندھ مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ پیر الٰہی بخش۔ خان بہادر اللہ بخش۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ حاجی سر عبداللہ ہارون اور جی۔ ایم سید بھی مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ ہندو اخبار مسلم لیگ کے خلاف الزام تراشی میں مصروف ہوگئے۔ اللہ بخش وزارت کو اسمبلی کے باہر سر لانسی لاٹ گراہم گورنر سندھ کی حمایت حاصل تھی اس طرح وہ اسمبلی کے ارکان کو مسلم لیگ کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ سر غلام حسین ہدایت اللہ جو کہ مسلم لیگی تھا ان ہی اثرات کی وجہ سے اللہ بخش وزارت میں شامل ہوئے کیونکہ خود اللہ بخش اور پیر الٰہی بخش مسلم لیگ سے پھر گئے تھے۔

مسجد منزل گاہ سکھر

اس عرصہ میں مسجد منزل گاہ سکھر کا سوال اٹھا یہ مسجد بندر روڈ پر سادھ بیلے کے سامنے ایک قدیم تاریخی یادگار ہے۔ اس کو ہندوؤں نے بند کر دیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کل سندھ مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ کراچی میں مسلمانوں نے اس مسجد کا سوال پیش

کیا تھا۔ اس سلسلہ میں مسلم لیگ نے کئی بار خان بہادر اللہ بخش کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ لیکن وہ ہمیشہ ٹالتے رہے یہاں تک کہ اس سوال نے سیاسی صورت اختیار کرلی اور مسلم لیگ نے مجبور ہو کر ایک ریسٹیوریشن کمیٹی RESTORATION COMMITTEE قائم کی۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مسلمانوں نے ستیہ گرہ شروع کی چنانچہ ایک ہزار مسلمان قید کرلئے گئے۔ جن کو بعد میں ۱۳ راکتوبر کو رہا کردیا گیا۔ حکومت نے مسجد پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا۔ اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ ۱۹ راکتوبر ۱۹۳۹ء کو سکھر اور اس کے قرب و جوار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے کچھ عرصہ بعد ۸ رمارچ ۱۹۴۰ء کو خان بہادر اللہ بخش وزارت ختم ہوگئی اور ان کی جگہ میر بندہ علی سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے۔ اور مسجد مسلمانوں کو مل گئی۔

میر بندہ علی نے بڑے نازک وقت میں وزارت سنبھالی تھی۔ اس لئے حالات کو سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ کیونکہ اسمبلی کے ارکان سندھ کے وڈیرے تھے اس لئے ایسی کوئی تجویز جس سے ان کے مفاد کو نقصان پہنچے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتی تھی۔ ان کی وزارت مخلوط تھی جس کی حقیقی طاقت کے مالک انگریز حاکم اور گورنر تھے اسی اثنا میں سیاسی پارٹیوں کے جوڑ توڑ کی بنا پر اور اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے میر بندہ علی نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دیدیا۔

میر بندہ علی کے بعد خان بہادر اللہ بخش نے ہندوؤں کی حمایت سے دوبارہ وزارت کی تشکیل کی۔ اس زمانہ میں سندھ میں بعض حالات نازک صورت اختیار کرچکے تھے۔ پیر صاحب پاگارو کی نظر بندی کی وجہ سے حُر مجاہدوں اور حکومت کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ سندھ میں بیس ہزار مربع میل کے علاقے میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا جو مکمل ایک سال تک رہا۔ اس عرصہ میں تیس ہزار فوج نے ہوائی جہاز اور دیگر ذرائع سے بغاوت ختم کرنے کی کوشش کی۔ پیر صاحب پاگارو کا مکان اور

بنگلہ مسمار کر دیا گیا۔ بارہ ہزار سے زائد حُروں کو نظر بند کیا گیا۔

سیّد صبغت اللہ شاہ ثانی کی جیل سے رہائی اور سندھ میں واپسی

ابھی حضرت پیر صاحب کے آزاد ہونے میں تقریباً ڈیڑھ سال باقی تھا کہ حکومت سندھ نے آپ کی جماعت کے خیالات اور عزائم کو جاننے اور جانچنے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ ہر تھانے میں مریدوں کو بلایا جانے لگا اور ہر بالغ اور بوڑھے مرد کے نام کا اندراج کیا گیا۔ اس کے بعد ان کو متعلقہ ضلع کے ایس پی اور کلکٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ گویا حکومت کی طرف سے ایک قسم کی پیش بندی تھی کہ اگر پیر صاحب جیل سے رہا ہو کر آنے کے بعد کوئی انقلابی قدم اٹھائیں تو ان لوگوں کو آسانی سے گرفتار کیا جا سکے۔ اس طریقے سے حکومت مریدوں کی تعداد۔ ان کی افرادی قوت اور عقیدت کا اندازہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

جیل سے رہائی کے بعد پیر صاحب نے سندھ میں واپس آتے ہی سب سے پہلے اپنے مریدوں کی اصلاح اور تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ آپ نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ ہمارے مرید ہر قسم کے نشہ سے پرہیز کریں۔ چنانچہ اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے حقّہ پینے والوں نے حقّہ چھوڑ دیا۔ سگریٹ نوشی کرنے والے اس سے تائب ہو گئے اور ہر بدعت کو معیوب تصوّر کرنے لگے اس سے جماعت کے اخلاق و اطوار پر نہایت عمدہ اثر پڑا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ عورتیں ہاتھی دانت کا چوڑا نہ پہنیں چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور عورتوں نے چوڑے توڑ دیئے۔ آپ نے اپنے طور پر ان دونوں احکام کی تعمیل کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں اور آپ کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان احکامات کی پوری پوری تعمیل ہوئی ہے۔

سانگھڑ میرپور روڈ پر سانگھڑ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر مریدوں نے

پیر صاحب کے لئے ایک بنگلہ تعمیر کر دیا تھا جسے گرنگ کہتے تھے اب اس کا نام پیر بنگلہ ہے۔ اس کے آس پاس میلوں تک گھنے جنگل تھے۔ یہ جگہ نہایت محفوظ تھی۔ آپ کے مرید وہاں اکثر جمع ہوتے تھے۔ اور آپ رات کو بھیس بدل کر ان میں مُرید کے روپ میں شامل ہو جاتے تھے۔ اور جن کو بیڑی یا لسوار استعمال کرتے ہوئے دیکھتے انہیں صبح اپنے پاس بلا کر تنبیہہ کرتے۔ اِسکا بھی خاطر خواہ اثر ہوا اس سے بعض مریدوں کو یہ خیال ہوا کہ پیر صاحب پر ان کی کوئی حالت مخفی نہیں ہے اور وہ خوف کے مارے بھی ہر حالت میں آپ کا ہر حکم ماننے کے لئے کمربستہ ہو گئے اس صورت حال سے مطمئن ہو کر آپ نے حکم دیا کہ ہمارا کوئی مرید ولائتی کپڑا نہ پہنے بلکہ اپنے ملک کا تیار کیا ہوا کپڑا استعمال کرے۔ اور ہر جگہ مسلمان ہوں یا ہندو آپس میں اتفاق سے رہیں۔ اور نفاق کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔ ان احکامات سے صاف ظاہر ہے کہ پیر صاحب کے ذہن میں انگریزی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کا کس قدر راسخ ارادہ تھا۔

انگریزی حکومت جو ہر لحاظ سے بیدار مغز تھی اور جس کے نظام سراغ رسانی نے ہر جگہ اپنے خفیہ ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ آپ کے ان احکامات کو سُنکر تلملا اُٹھی کیونکہ بدیشی کپڑے کو چھوڑنے کا مطلب بالواسطہ طور پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آغاز تھا۔ حکومت پہلے ہی بدظن تھی۔ مگر ان احکامات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اسی دوران پیر صاحب نے حکم دیا کہ جماعت کے جو افراد غازیوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہیں۔ وہ سامنے آئیں چنانچہ جماعت کے بڑے بڑے خلفا کو حکم دیا گیا کہ گوٹھوں میں جا کر غازیوں کے نام لکھیں اور ان کی فہرستیں تیار کریں۔ پیر صاحب کو صرف ناموں کی ضرورت نہ تھی بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ہر مرید کو آزمائش کی کسوٹی سے گذارا جائے تاکہ مخلصین کا اندازہ ہو سکے چنانچہ گرنگ والے بنگلے میں آپ نے مختلف

اوقات میں ان غازیوں کا بنفس نفیس معائنہ کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ آپ کرسی پر تشریف رکھتے اور تھوڑے تھوڑے غازی پندرہ بیس کے گروپ میں حاضر ہوتے۔ جب سب اکھٹے ہو جاتے تو حکم ہوتا کہ قطار میں بیٹھ جائیں۔ جب قطاریں بن جاتیں تو آپ فرماتے "کیا تم سب غازی ہو"

مرید عرض کرتے "ہاں قبلہ"

آپ پھر ارشاد فرماتے "فقیرو تم کو مبارک ہو کہ تم غازی ہو کر آئے ہو تم پر ہزار رحمت ہو۔ ہم انشاء اللہ دوست رہیں گے۔ جو تم میں سے زندہ رہیں گے وہ بہت کچھ دیکھیں گے" اگر کسی کو ذرا سا بد دل پاتے تو اسکی ہمت افزائی کرتے کئی گروپ آتے وقت بھیج پاگارو کے نعرے لگاتے۔ اگرچہ پیر صاحب نے غازی بننے اور سر فروشی کرنے کا مقصد ان کو نہیں بتایا تھا۔ لیکن غازی کا لفظ ہی خود بخود مریدوں کو یہ سمجھانے کے لئے کافی تھا کہ انہیں جان کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔

پیر صاحب انگریز کے زبردست تسلط سے بخوبی واقف تھے اس لئے نہایت خاموشی سے اندر ہی اندر جماعت کی اصلاح کرتے اور انہیں سر فروشی کا درس دینے کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لئے تیار بھی کرتے رہے۔ ان ایام میں مسجد منزل گاہ سکھر کا جھگڑا پورے زوروں پر تھا اور ہندو اور مسلمان آپس میں نبرد آزما تھے۔ پیر صاحب نے دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے غازیوں کو حکم دیا کہ گوٹھوں میں ہندو مسلم فساد نہ ہونے دیں۔ اس طرح آپ کے غازیوں کے خلاف جو اندیشے تھے وہ خود بخود ماند پڑ گئے۔ اور اس فراست سے غازیوں کے دستے اور بھی مضبوط ہوتے رہے۔ لیکن حکومت کے کارندوں نے پیر صاحب کو بدنام کرنے اور غازیوں کی بھرتی کو بند کرانے کے لئے خفیہ طور پر یہ پروگرام بنایا کہ پیر صاحب کے گوٹھ میں رہنے والے ہندوؤں پر حملہ کرایا جائے۔ جس رات اس سازش کے مطابق حملہ ہونے والا تھا۔ پیر صاحب کو گرفتنگ

کے بنگلے میں اسکی بھنک پڑ گئی۔ آپ نے فوراً حفاظتی اقدامات کرنے کا حکم دیا اور غازیوں نے اپنی قوت کا اس قدر بھرپور مظاہرہ کیا کہ حملہ آوروں کو گڑبڑ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے روز پیر گوٹھ کے ہندوؤں کا ایک وفد کلکٹر سکھر کے پاس پہنچا اور اس نے بیان دیا کہ پیر صاحب کے غازیوں نے رات ہماری جان بچائی ہے اور حکومت کو بھی اسی مضمون کی تاریں دی گیئں۔ اس حکمت عملی۔ فراست اور ہوشیاری سے غازیوں کی بھرتی بند کرانے انہیں نقصان رسانے اور پیر صاحب کو زک پہنچانے کی تمام سازشیں ناکام ہوگئیں۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد کلکٹر سکھر کی طرف سے آپ کو ملاقات کرنے کا ایک پیغام پہنچا۔ آپ نے اپنی فراست سے آنے والے خطرے کو بھانپ کر اپنے خلیفہ احمد کو سکھر بھیجا کہ جاکر کلکٹر سے ملاقات کرے اس وقت سکھر کا کلکٹر کوٹا والا تھا جس سے خلیفہ احمد نے ملاقات کی۔ اور اس سے گجراتی زبان میں گفتگو کی۔ کلکٹر پارسی تھا۔ اور گجراتی اسکی مادری زبان تھی۔ وہ خلیفہ احمد سے بہت اچھی طرح سے پیش آیا۔ اور اسے کہا۔ کہ حضرت پیر صاحب کے نام یہ خاص پیغام ہے کہ آپ نے امن وامان برقرار رکھنے کے لئے جو کام کیا ہے۔ سرکار انگریز اس کے صلے میں آپ کو ایک "تلوار اور ایک بندوق دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور آپ کو خطاب بھی دیا جائے گا۔ امید ہے کہ پیر صاحب یہ انعامات قبول کریں گے۔ خلیفہ احمد نے یہ ساری واردات حضرت پیر صاحب کے گوش گذار کی۔ حضرت نے فرمایا کہ تم واپس کلکٹر کے پاس جاؤ اور اسے ان انعامات کے لئے شکریہ ادا کرنے کے بعد کہو کہ ہمارے پاس ہتھیار کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ہمارے لئے ہمارا خاندانی خطاب "پیر پاگارو" ہی کافی ہے۔ ہمیں کسی دوسرے خطاب یا القاب کی ضرورت نہیں ہے۔

خلیفہ احمد نے واپس جاکر جب کلکٹر کو یہ پیغام پہنچایا تو اس نے کہا کہ حضرت

پیر صاحب نے بڑی زبردست غلطی کی ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ آپ کے اِس انکار کو شک کی نظر سے دیکھیگی۔

انگریز سرکار کی طرف سے حضرت پیر صاحب کے نظریات۔ رجحانات اور عزائم کو جانچنے کی یہ آخری کوشش تھی۔ چنانچہ اس کے بعد حکومت کو یقین ہو گیا کہ پیر صاحب کی وفاداری مشکوک ہے۔ اس عرصہ میں پیر صاحب کے خاص مریدوں اور خلفا کے خلاف کاغذی کارروائیاں پوری ہو چکی تھیں۔ پیر صاحب نے اپنا مرکز اب گڑنگ کو بنا لیا تھا۔ کیونکہ آپ کے عزائم کی تکمیل کے لئے یہ بہترین پناہ گاہ تھی اور آپ کا خیال تھا کہ یہاں کم از کم چھ ماہ تک قیام کیا جائے۔ آپنے ایک خاص دستہ تیار کر کے اسے مناسب جنگی تربیت دلائی۔ اور اسے ہر لحاظ سے آزما کر اطمینان کر لیا آپکے مریدوں میں انگریز کے خلاف زبردست نفرت پائی جاتی تھی۔ آپ انگریز کے خلاف کیا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے کونسا طریقہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے متعلق کچھ واضح احکامات نہیں ملتے۔ اگرچہ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ پیر صاحب اپنے مریدوں کو رائفل اور بندوق کی ٹریننگ دلا کر انگریزوں سے ٹکر لیں گے۔ لیکن کسی طرح اسکی تصدیق نہیں ہو سکی۔ آپکے ارادوں کا کسی کو علم نہ تھا۔ اگرچہ جنگی تربیت آپ کے عام مریدوں میں باقاعدہ جاری تھی۔ لیکن انگریز حکومت چونکہ آپ کو باغی تصور کرتی تھی اس لیئے اس کے نزدیک آپ سے بالواسطہ ٹکر لیکر آپ پر گرفت کرنا بے حد ضروری تھا۔ اور وہ موقعہ کی تلاش میں تھی۔ چنانچہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیئے گئے:۔

(۱) ہر قسم کے جرائم میں بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے حروں کو ان کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ اور ان میں سے خاص خاص با اثر لوگوں کو گرفتار کرنے کے لئے کاغذات مکمل کر لئے گئے۔

(۲) ہر چھوٹے بڑے حُر کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا گیا کہ اپنے حلقہ کے تھانے میں ہر ہفتہ میں ایک بار ضرور حاضری دے۔ بعض "خطرناک" حُروں کے لئے ہفتہ کی بجائے روزانہ حاضری کی پابندی عائد کر دی گئی۔

(۳) گرنگ والے بنگلے پر پولیس کا ایک دستہ نگہبانی کے لئے مقرر کر دیا۔

پیر صاحب نے ان تینوں پابندیوں کے خلاف حکومت سے نہایت پرزور احتجاج کیا مگر سب بے کار ثابت ہوا۔ خاص طور پر آپ نے بعض حُروں کی روزانہ حاضری کی پابندی کے خلاف نہایت شدومد سے احتجاج کیا کہ جو لوگ آٹھ آٹھ اور دس دس میل سے روزانہ حاضری دینے کے لئے آتے ہیں وہ اپنے بال بچوں کے لئے روزی کس وقت کمائیں۔ اور صرف لفظ حُر سے متنفر ہو کر ہر قسم کے غریب اور شریف انسانوں پر اسقدر ظلم و جبر کرنا انصاف کے سراسر منافی ہے۔ لیکن حکومت نے ان احتجاجات کا کوئی نوٹس نہ لیکر اور زیادہ سختی شروع کر دی۔ آخر کار پیر صاحب نے تنگ آکر روزانہ حاضری دینے والے بعض جری قسم کے حُروں کو بلاکر حکم دیا کہ اب تم آئندہ حاضری کے لئے تھانے ہرگز نہ جانا۔ یہ گویا حکومت کے ظلم اور جبر و استبداد کے خلاف اس مجاہدِ اعظم کی پہلی پکار تھی۔ یہ حکومت کی نافرمانی کی ابتدا تھی۔ اس حکم کے بعد وہ منتخب مرید حاضری دینے کی بجائے روپوش ہو گئے

اب حکومت کی طرف سے پیر صاحب پر دباؤ ڈالا گیا کہ انہیں حاضر کریں۔ آپ نے فرمایا۔ سرکار انہیں خود ڈھونڈے۔ مجھے ان کا کوئی علم نہیں ہے۔ خوشامدی سرکاری ملازمین نے حکام بالا کی ہدایات کے مطابق ان روپوش ہونے والے مریدوں کو ڈھونڈھنے کے ساتھ ساتھ باقی جماعت اور خود پیر صاحب کے خلاف انگریز حکومت کو طرح طرح کی رپورٹیں بھیجنی شروع کر دیں۔ چونکہ پیر صاحب کو اسکی پوری پوری خبر تھی۔ اس لئے جب ـــــ آفیسر آپ سے ملاقات کے لئے آتے تو آپ انہیں

حقارت سے دیکھتے۔ اگرچہ بعض خیر خواہوں اور مریدوں نے آپ سے عرض کیا کہ ان حکام کو خوش کیا جائے تاکہ وہ آپ کا ساتھ دیں۔ مگر آپ نے سختی سے انکار کر دیا اور فرمایا۔ رشوت دینا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔

آخر کچھ عرصہ بعد آپ کو نظر بندی کی حالت میں گڑھنگ سے کراچی لے جایا گیا جہاں سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعلیٰ سندھ نے آپ سے کہا کہ نظر بندی کے قانون کے تحت آپ کو کراچی میں ہی رہنا پڑے گا۔ آپ باہر نہیں جا سکتے۔ آپ نے فرمایا "اگر ہم نے کوئی جُرم کیا ہے تو سرکار ہم پر مقدمہ چلائے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ نے کراچی میں بُلا کر ہمیں یہاں نظر بند کرنے کی دھمکی دی ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں تحریری حکمنامہ دیا جائے تاکہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں"۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ دیا گیا آخر آپ نے سر غلام حسین ہدایت اللہ سے کہا کہ "یہ نظر بندی بالکل بے قاعدہ اور غیر قانونی ہے اور ہم یہاں کسی صورت میں بھی نہیں رہیں گے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے کر لو" اس کے بعد آپ راتوں رات موٹر کے ذریعہ کراچی سے گڑھنگ پہنچ گئے۔ اب آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ حکومت آپ کے خلاف ضرور کاروائی کرے گی۔ اسلئے آپ نے خاص مریدوں کو حکم دیدیا کہ اگر معاملہ بگڑ جائے تو باقاعدہ منظم ہو کر ہماری دی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ اس کے بعد آپ درگاہ شریف (کنگری) پہنچے وہاں بھی ضروری احکام دیئے۔ دوسرے دن آپ کو کراچی لے جا کر نظر بند کر دیا گیا۔

ابتلا کا دور اور آپ کا استقلال

یہ وہ وقت تھا جب جرمنی کے ہٹلر اور جاپان کے جرنل ٹوجو نے انگریزوں پر جاں کنی کا عالم طاری کر رکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ جنرل رومیل کی سرکردگی میں جرمن فوجیں نہر سوئیز کے علاقے میں اور جاپانی

کلکتہ کے گرد و نواح تک بڑھ آئے تھے۔ اس عالم میں انگریز اندرونی طور پر کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ ایک دم سندھ کے بیس ہزار مربع میل کے علاقے میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر رات کو ریلیں چلنا بند ہو گئیں۔ تیس ہزار مسلح گورا فوج۔ ٹینک اور ہوائی جہازوں سے لیس سندھ میں تعینات کی گئی۔ مگر حُر ایسے تمام عسکری انتظام کو خاطر میں نہ لائے اور انہوں نے اپنی انقلابی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ تاریخ آزادی اور انگریز کے خلاف بغاوت کا یہ وہ باب ہے جس کی مثال ہندوستان کا کوئی صوبہ پیش نہیں کر سکتا۔ ہندو جیسی دولت مند اور با اختیار قوم جب عدم تشدد کی بنیاد پر محض سیاسی جنگ لڑنے پر مجبور تھی۔ اس وقت حُر سندھ میں انگریز سے مسلح جنگ اس طرح کر رہے تھے کہ پیر صاحب کے گاؤں اور ان کے بنگلہ واقع گڑنگ میں بھی بمباری کی گئی۔ حُر مجاہدوں اور ان کے ٹھکانوں پر بمباری کرنے کے لئے خاص طور پر پٹیارو کا ہوائی اڈہ استعمال کیا گیا۔ اکثر علاقوں میں شام سے صبح تک کسی کے نظر آنے پر ہی گولی مار دی جاتی تھی گولیوں کی بوچھاڑ میں آگ اور خون کا یہ کھیل کئی سال تک جاری رہا۔ حُروں سے جیلیں بھر گئیں۔ تمام رات ان کو پھانسیوں پر لٹکایا جاتا رہا۔ انگریز حُروں کی اس جنگ آزادی سے اس قدر پاگل ہو چکا تھا۔ کہ اپنی روایتی قانون دانی اور انصاف پسندی بھی بھلا بیٹھا۔

حُر تحریک کی جنگ آزادی کے سلسلے میں ایک ہولناک واقعہ بھی رونما ہوا جس نے انگریزوں کی بربریت میں اضافہ کر دیا۔ حُر چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خاص ایجنٹ یعنی سندھ کے وزیر اعلیٰ خان بہادر اللہ بخش اور ان کے وزیر مال نیچل داس کو کسی نہ کسی طریقے سے ہلاک کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کے خیال میں حُروں پر سب مصائب کا باعث یہی لوگ تھے۔ اس مقصد کے لئے میل ٹرین کو

الٹ کر حادثہ سے دوچار کیا گیا۔ مگر یہ دونوں بچ گئے اور ان کے دھوکے میں دوسرے لوگ مارے گئے۔ اللہ بخش اور نچل داس اس گاڑی میں کراچی کینٹ سے سوار ہوئے اس اطلاع کے ملتے ہی حُروں نے اس گاڑی کو حیدرآباد سے ۴۵ میل دور اڈیرو لعل اور ٹنڈو آدم کے درمیان روک کر ان کو ہلاک کرنے کا پروگرام بنایا۔ پروگرام کے عین مطابق گوریلا جنگ کے ماہروں نے ان کے فرسٹ کلاس کے ڈبے اچانک پٹڑی سے اتارنے کا بندوبست کیا۔ ایسا ہی ہوا اور اعلیٰ درجہ ——— کی بوگیاں مقررہ مقام پر الٹ گئیں۔ یہ گاڑی ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ کراچی کا ایک انقلابی نوجوان مستی خان اپنے ہمراہیوں سمیت اسی گاڑی میں موجود تھا۔ ان لوگوں نے رات کی تاریکی میں اس حادثہ کے بعد انگریزوں کے پٹھوؤں کو قتل کرنا شروع کیا۔ نچل داس وزیرانی ایک الٹی ہوئی بوگی کے پاخانے میں چھپ گیا۔ البتہ ایک اور نوجوان منور حسین مارا گیا۔ یہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کا لڑکا تھا جو اسی گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اللہ بخش سومرو کے بچنے کا سبب یہ ہوا کہ حیدرآباد اسٹیشن پر کئی دوست ان سے ملنے آئے اور طے پایا کہ وہ رات کو حیدرآباد میں قیام کریں۔ چنانچہ اللہ بخش بغیر پروگرام کے اچانک حیدرآباد اُتر گئے۔ اور قتل ہونے سے بچ گئے۔ اس حادثہ کے بعد حُروں کے خلاف انگریز کی ستم رانیوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ حُروں پر انگریزوں کے ظلم و ستم کا سلسلہ اسی وقت ختم ہوا جبکہ انگریز ہی یہاں سے رخصت ہوگیا۔

پیر صاحب پر مقدمہ اور اس کا نتیجہ

پیر صاحب کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاریاں پوری کر لی گئیں اور ان پر بغاوت، قتل و غارت گری اور ایسے ہی دوسرے الزامات لگائے گئے ادھر یہ کاغذی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر گڑنگ۔ والے بنگلے کا محاصرہ کر لیا گیا بنگلے کے باہر جتنی جھونپڑیاں تھیں سب کو جلا دیا۔ بنگلے پر بمباری کی گئی اور

پیر گوٹھ میں آپ کی حویلیوں اور فصیل کو بارودی سرنگوں کے ذریعہ کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن اس سے بھی حُروں کی کارروائیوں میں کوئی فرق نہ آیا اور انہوں نے مارشل لا کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایسے کڑے اور نازک وقت میں جبکہ ظالم جابر اور مضبوط حکومت اپنے تمام وسائل کے ساتھ حُروں کا قلع قمع کرنے میں مصروف تھی۔ ان غازیوں نے جس بہادری اور جانبازی سے ان کا مقابلہ کیا ان کی داستانیں لکھنے کے لئے علیحدہ باب کی ضرورت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم مضمون کی طوالت کی وجہ سے اس پر تفصیل سے نہیں لکھ سکتے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ داستانیں کبھی نہ کبھی زیب قرطاس ہونگی۔ محترم محمد عثمان ڈیپلائی صاحب نے اپنے ناول سانگھڑ میں ان داستانوں کو یکجا کرنے میں ناقص کوشش کی ہے۔ مگر اردو لٹریچر میں ابھی تک اس موضوع پر کوئی مواد منتقل نہیں کیا گیا۔

پیر صاحب کی تربیت اور غازیوں کی عقیدت اسقدر قابلِ تعریف ہے کہ آپ کی غیر حاضری میں بھی یہ جدّ و جہد مسلسل جاری رہی۔ اگر بڑے مارے جاتے رہے تو ان کی جگہ پر چھوٹے سینہ سپر ہوتے رہے۔ اسی دور میں کتنے ہی ملکی آدمیوں نے حکومت کے زور اور دباؤ میں آکر حُروں کی جاسوسی کی اور حُروں کو پکڑوایا اس کا بدلہ حُروں نے جوابی حملے کر کے لیا۔ اس جنگ میں بیشک گندم کے ساتھ گھن بھی پسا۔ ایک طرف ملک کے کافی بے گناہ آدمی مارے گئے تو دوسری طرف مارشل لا کی آڑ میں ملٹری والوں نے بے انتہا ظلم و ستم کیا۔ نہ فقط حُروں پر بلکہ پیر صاحب کے عام مریدوں کو خواہ وہ ان سے تعلق رکھتے ہوں یا نہیں معہ اہل و عیال گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا۔ جہاں پر سینکڑوں بچے۔ بوڑھے۔ بھوک اور بیماری کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گئے۔ حیدر آباد جیل میں انگریزوں نے اپنے آدمیوں کو برقعے پہنا کر حُروں کی پہچان کے لئے بھیجا تھا۔ ان برقعہ پوشوں نے نہ صرف

اپنے آقاؤں کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے نوجوانوں پر ہاتھ رکھے اور وہ نوجوان صرف ان برقعہ پوشوں کی نشاندہی پر پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک برقعہ پوش نے ایسے آدمی پر ہاتھ رکھا جو مارشل لا سے پہلے کا قیدی تھا۔ جب اس قیدی نے واویلا مچایا تب جاکر برقعہ پوشوں کی قلعی کھلی۔ بہرحال اس ہیبت ناک ماحول میں سندھ کے کچھ وڈیروں اور زمینداروں سے گواہیاں دلواکر پیر صاحب کیلئے جان کی سزا مقرر کی گئی۔ پیر صاحب کا دستور العمل یہ تھا کہ آپ عبادت گذار اور شب بیدار تھے۔ ایک انگریز لیمبرک یا مسٹر کوپر آپ کے ساتھ رات کو شطرنج کھیلنے آیا کرتا تھا اور ہر روز ہار جاتا تھا۔ پھانسی ملنے سے ایک رات پہلے وہ انگریز اس خیال سے آیا تھا کہ پیر صاحب اپنے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں گے اور وہ آسانی سے بازی جیت لیگا۔ لیکن اسکی امیدوں پر اسوقت پانی پھر گیا۔ جب پیر صاحب نے نہایت صبر و سکون سے بازی جیت لی وہ آپ کے اس سکونِ قلب کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ پیر صاحب نے اسے حیرت زدہ دیکھکر فرمایا کہ حق کی راہ میں شہادت حاصل کرنا تو میرے آباؤاجداد کی سنت ہے۔ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اسکی خاطر ہنستے کھیلتے پھانسی کے تختہ پر چڑھ جانا ہمارے لئے عین عبادت ہے۔ ہم غلام بننے کے لئے پیدا نہیں ہوئے بلکہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ وہ ظالم یہ باتیں سُنکر اپنا سامنہ لیکر رہ گیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس مجاہدِ اعظم کی رگوں میں شہیدِ کربلا کا خون دوڑ رہا ہے۔

جابر انگریز حکمرانوں کا سندھ پر اسقدر خوف طاری تھا کہ یہاں پر کسی کو کلمۂ حق کہنے کی توفیق نہ تھی۔ حالانکہ علی گڑھ یونیورسٹی کے نوجوانوں کا ایک وفد دہلی میں مرحوم لیاقت علی خان سے ملا اور انہوں نے پیر صاحب کی حمایت میں بہت کچھ کہا۔ مرحوم نے اس وفد کی باتیں سُنکر کہا کہ ہم تو پیر صاحب کی

خاطر بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سندھ کے مسلم لیگیوں میں کوئی دم نہیں ہے اسلئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سرزمین سندھ کے اس مجاہد اعظم کی حمایت میں سندھ کے کسی کونے سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔

تحریک۔ مجاہدین کے قائد تحریک خلافت کے سرگرم کارکن جیوش احرارِ ہند کے سالار اعظم اور آخری آل انڈیا آرائیں کانفرنس کے صدر سردار محمد شفیع نے اپنی کتاب "دورِ مستقبل" میں، لکھا ہے۔

"محترم پیر صاحب پاگارو ملک کے ہیرو تھے وہ وقت آئیگا جب اس بہادر رہنما کا سارے پاکستان میں ہر سال یادگار ڈے منایا جائے گا۔ ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمگیر جنگ میں جب ہندوستان بھر سے قلیل تنخواہ پر کفار کی فوج میں بھرتی ہو کر مسلمان خدا کی مخلوق کو مارنے کے لئے انگریز کے ساتھ لپک لپک کر جارہے تھے۔ اس وقت سندھ کے قابلِ احترام پیر پاگارو ملک کو آزاد کرانے کے منصوبے بنا رہے تھے انہوں نے اسلحہ جمع کر لیا تھا۔ اپنے مریدوں کو مسلح کر کے حملہ کرنے کے موزوں وقت کے منتظر تھے کہ ان کے بعض قریبی عزیزوں اور سرکار کے ایجنٹوں نے اس تیاری کا راز انگریز کو بتا دیا۔ اور محترم پیر صاحب کو گرفتار کروایا۔ پھر ان کو ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ اور ایک مقدمے کا ڈھونگ رچا کر آپ کو پھانسی دے دی گئی۔ پنجاب میں صرف مجلسِ احرار نے خون کے آنسو بہائے۔ ایک ریزولیوشن پیر صاحب کی حمایت اور انگریزوں کے ان مظالم کے خلاف پاس کر کے ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جس پر ان کے تین سو کارکن گرفتار کیئے گئے اور ان کو ایک ایک

سال کی سزا دیکر جیلوں میں بھیج گیا ۔ انگریز نے سندھ میں مارشل لا
لگا کر حُروں کو جنگلوں میں گھیر گھیر کر گولیوں کا نشانہ بنایا۔ ان کے
لئے اسپیشل جیل بنے اور کئی سال تک ان پر تشدد ہوتا رہا ۔ اب وقت
آگیا ہے کہ کوئی صاحبِ قلم اور اہلِ دل ان بہادروں کی مکمل اور
مفصّل تاریخ لکھکر آنے والی نسلوں کو ان سے روشناس کرانے
کا بندوبست کرے ۔ ایسا بہادر رہنما اور ایسے بہادر لوگ تاریکی میں
گم نہیں کئے جا سکتے ۔"

مقدمہ کے دوران انگریزی حکومت نے اپنے کئی ایجنٹوں کو پیر صاحب کے پاس
بھیجا کہ وہ حکومت سے معافی مانگ لیں تو انہیں معاف کیا جا سکتا ہے اور اسطرح
وہ پھانسی سے بچ سکتے ہیں ۔ لیکن پیر صاحب نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا
اور بلاشبہ آزادی کا پرستار اور سادات کا سپوت ایسے ہی جواب دے سکتا
ہے ۔ آپ نے فرمایا :-

" شہادت ہمارا تاج ہے ۔ اسے آگے بڑھ کر پہن لینا ہمارے لئے
عبادت ہے ۔ ہم نے صرف آزادی کو چاہا ہے اور یہ کوئی جرم نہیں
ہے ۔ انسان سے معافی مانگنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ ہم تو
صرف اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ۔"

بہرحال ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو فجر کے وقت آپ کو پھانسی دیدی گئی
چونکہ آپ حق پر تھے اس لئے نہایت سکونِ قلب سے موت کا ذائقہ چکھا
چہرے پر سکون کے آثار تھے اور کرب و بے چینی کی کوئی علامت موجود نہ تھی ۔ اس
کے بعد خلفاء کو آپ کی زیارت کرائی گئی ۔ یہی لوگ تھے جنہیں آپ کی موت کا
یقین نہیں آتا تھا ۔ کیونکہ انہوں نے کسی مرنے والے کے چہرے پر اسقدر سکون

اور اطمینان کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ پیر صاحب کو پھانسی نہیں دی گئی۔ بلکہ ان کو انجکشن لگا کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اور انگریز انہیں کسی دوسرے ملک میں لے گئے ہیں۔

کتنی بدنصیب سرزمین سندھ ہے جسے اپنے عظیم سپوت اور شہید حریت کی لاش تک نصیب نہ ہوئی یہ معمہ آجتک لاینحل ہے کہ پیر صاحب کی لاش کہاں مدفون ہے۔

پیر صاحبؒ کی ذاتی زندگی

قاضی محمد اکبر صاحب لکھتے ہیں

"مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے پیر صاحب کو اپنی چشم گنہ گار سے دیکھا ہے۔ یہ انسانی حسن کا نادر نمونہ تھے۔ اور روحانی عظمت نے ان کے چہرے پر بلا کا نور اور جلال بکھیر دیا تھا کہ کوئی شخص خواہ وہ کس قدر بھی مضبوط دل رکھتا ہو۔ ان سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ بڑے بڑے انگریز۔ سر اور خان بہادر اس مجاہدِ اعظم کے سامنے جاتے تو ایکبارگی لرز جاتے تھے۔ لیکن یہ کسقدر شرمناک حقیقت ہے کہ اس عظیم انقلابی مجاہد کے خلاف جھوٹا مقدمہ گھڑنے والے اور شہادتیں دینے والے بیگانے نہ تھے خود اپنے ہی تھے۔ اس طرح انہوں نے غداری کی روایت یہاں بھی قائم رکھی۔ بہرحال انگریز حُر جماعت کو کچل نہ سکا اور نہ اس کا شیرازہ منتشر کر سکا۔"

سہ ماہی "مہران" حیدرآباد کے نمبر ۳۔ اور ۴ سال ۱۹۵۷ میں حضرت پیر صاحب کی ذاتی زندگی کے متعلق جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت پیر صاحب کی ذاتی زندگی کے متعلق مندرجہ ذیل حقیقتیں معلوم ہو سکی ہیں:۔

۱۔ بسا اوقات اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے تیار کرتے تھے۔
۲۔ فجر سے پہلے اٹھکر ورزش کرتے۔ اور اسکے بعد نماز ادا کرتے۔
۳۔ اکثر اوقات اپنے مریدوں کے ساتھ مل کر کام کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ کھیتی کو باڑھ دینے میں بھی فقیروں کا ہاتھ بٹایا۔
۴۔ اگر کوئی مرید نقد نذرانہ پیش کرتا اور عرض کرتا کہ قبلہ قبول فرمائیں تو آپ فرماتے "قبول" لیکن اگر کوئی ایک لاکھ بار صلوٰۃ کا ہدیہ پیش کرتا تو فرماتے "قبول ہے اور تم پر آفرین ہو" اور اس کے لئے دُعا کرتے۔
۵۔ آپ کا دستور تھا کہ نقد نذرانہ اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔ لیکن اگر کوئی فقیر مسواکیں پیش کرتا تو ہاتھ بڑھا کر وصول کر لیتے۔
۶۔ ایک دفعہ سیٹھ ارجہ سے دور بھرتّی کے گوٹھ میں ایک دعوت پر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک عورت چنوں کی ایک چھبی (رکابی) لیکر حاضر ہوئی آپ نے فرمایا "اماں ان کو تم ہی اچھی طرح پکا سکتی ہو۔ لہٰذا اسے پکا کر لاؤ اور اس کے ساتھ جوار کی روٹی بھی لاؤ۔ میں تمہاری دعوت کھاؤں گا۔ اور باقی جماعت میزبان کی دعوت کھائے گی۔
۷۔ ایک دفعہ گرڈنگ کے بنگلے میں ایک ڈپٹی کلکٹر نے آپ سے پوچھا کہ آپ حکومت کے کارندوں کی خاطر خواہ عزت کیوں نہیں کرتے آپ نے فرمایا "ان لوگوں کی عادات و اطوار دیکھکر جب کبھی میں یہ ارادہ بھی کرتا ہوں کہ ان کی عزت کروں تو مجھے اپنے حُسینی ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔

دشمنوں کی چیرہ دستیاں | طلوع آزادی سے کئی برس قبل یعنی

حضرت پیر صاحب کی شہادت کے بعد ہی انگریز نے آپ کی گدی مستقل طور پر ختم کر دی۔ تاکہ آئندہ اس خاندان سے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ آپ کے دونوں صغیر سن صاحبزادوں پیر سکندر شاہ اور پیر نادر شاہ کو تعلیم کے بہانے لندن روانہ کر دیا گیا۔ آپ کے گوٹھ واقع کنگری پر اس قدر بمباری کی گئی کہ وہاں صرف ملبہ کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ اس پر بھی جب حُروں کی سرگرمیاں ماند نہ پڑیں تو انگریزوں نے حیلہ و فن سے کام لیکر آپ کی گدّی پر اپنے مطلب کا آلۂ کار بننے والے کسی فرد کو مسند نشین کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس وقت حیدر آباد کے کلکٹر محمد بخش تھے۔ جن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ انگریزوں سے بھرپور تعاون کرنے والے سجادہ نشین کو مقرر کرنے کی کوشش کریں اور حُروں کے خلفا اور با اثر افراد کی کانفرنس بلا کر ان سے اسکی توثیق کرالیں۔ چنانچہ سرکاری اہتمام سے ایسے حروں کی ایک کانفرنس بھی بلائی گئی۔ لیکن اس شیر دل جماعت کے ہر رکن نے بیک زبان اس گھناؤنی تجویز کو یکسر مسترد کر دیا اور صاف الفاظ میں کہدیا کہ پیر پاگارو کا جانشین ان کا جائز وارث ہی ہوسکتا ہے اور وہ جائز وارث ان کے بڑے صاحبزادے پیر سکندر شاہ ہیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے فرد کو اس گدّی پر متمکن ہونے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ چنانچہ انگریز حکومت اپنا سامنہ لیکر رہ گئی اور آخر کار قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں مرحوم لیاقت علی خاں ان دونوں صاحبزادوں کو لندن سے واپس لے آئے۔ ان کی آمد پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ چنانچہ پیر سکندر شاہ کو شاہ مردان شاہ ثانی کے لقب سے سجادہ نشین بنا کر ان کے پیر پاگارو ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اس سجادہ نشینی کی تقریب کو بڑے پرشکوہ انداز میں پورے سندھ کے مسلمانوں نے اور بالخصوص حُروں نے منایا۔ اور دستار بندی کی رسم ادا کی گئی۔

حضرت شہید کی جدوجہد کا ایک جائزہ

جب سرزمین سندھ میں لوگ انگریزوں کی خوشامد کرنے اور ان سے انعام واکرام پانے کو عین سعادت سمجھتے تھے اس وقت حضرت شہید ان غیرملکی حکمرانوں کے ناپاک قدموں سے اس سرزمین کو پاک کرنے کے لئے منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ آپ کا عسکری نظام یعنی حُروں کے دستے آپ کے ایک اشارے پر جاں فروشی کی رنگین داستانیں لکھنے کے لئے ہر وقت کمربستہ تھے۔ حالانکہ جابر حکمرانوں نے ان کو ہر لحاظ سے کچلنے اور تباہ کرنے کے لئے اپنے سب ہتھیاروں کو آزما لیا تھا جب ۱۹۴۲ء میں ہندوستان بھر میں کوئٹ انڈیا QUIT INDIA کا زور شور تھا اور سب تحریکیں صرف زبانی نعروں پر ہی زور دے رہی تھیں۔ اسوقت حضرت شہید اس مضبوط ترین حکومت سے باقاعدہ نبرد آزما تھے۔ اسی وقت جناب جی۔ایم سیّد نے اپنی مختلف تحریروں میں پیر صاحب کو مجاہد اعظم اور رئیس الاحرار لکھا ہے۔

جب مسلم لیگ کا ایک وفد جسمیں ڈیپلائی صاحب کی روایت کے مطابق جناب جی۔ایم۔سیّد صاحب بھی شامل تھے۔ آپ سے گڑنگ کے بنگلہ میں ملا اور آزادیٔ وطن کے لئے آپ کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی تو آپ نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ ہمارے طریقۂ کار اور مسلم لیگ کے نظریات میں بہت فرق ہے۔ اسلئے ہم اس میں شمولیت کرنے سے معذور ہیں۔ پھر جب کانگریس کا ایک وفد جو ڈاکٹر چوئتھ رام اس کے بھائی شام داس پروفیسر گھنشام اور سیٹھ سیتل داس وغیرہ پر مشتمل تھا آپ سے کانگریس میں شمولیت کی درخواست لے کر اسی بنگلے میں آپ سے ملا تو آپ نے ان کو بھی صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ہم کسی کی سیادت اور قیادت قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے رہنما۔ ہادیٔ برحق حضرت محمد رسول اللہ (صلعم) ہیں اور ہمارا دستور العمل قرآن ہے۔ چنانچہ یہ دونوں وفود ناکام واپس ہوگئے اس

سے آپ کے عزم و ارادہ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگر سندھ میں ایسے ہی جواں مرد حریت پسند اور بہادر قسم کے لوگ آپ سے تعاون کرنے پر تیار ہو جاتے تو انگریز کو شاید ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی بوریا بستر باندھ کر یہاں سے نکلنا پڑتا۔

جیل کی زندگی کے دوران آپکی استقامت اور ملکی سیاست پر غور و فکر قابل قدر اور دوسروں کے لئے دعوت عمل ہے۔

ملٹری کورٹ میں جب آپ پر مقدمہ چلایا گیا تو آپ نے اس سے بیزاری اور بے رُخی کا اس انداز سے اظہار کیا جو حریت پسندوں اور مجاہدوں کی شایانِ شان ہے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈالنا پسند کر لیا۔ لیکن کافر کی غلامی اور جابر سے معافی طلب کرنے کو ہرگز گوارا نہ کیا۔

آپ کے دونوں صاحبزادوں کو تعلیم کے بہانے سے لندن لیجایا گیا۔ تاکہ اس خاندان کا چراغ گل کیا جائے۔ اور یہ گدّی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے۔ لیکن ان کی یہ دونوں سازشیں ناکام ہوئیں اور آخر کار فتح حق و صداقت کی ہوئی۔

حُروں کو کچلنے کے لئے مارشل لا کے ساتھ ساتھ حُر ایکٹ بھی نافذ کیا گیا جسکے تحت انھیں جرائم پیشہ اقوام میں شامل کیا گیا۔ تاکہ مختلف حیلہ سازیوں سے انکی افرادی طاقت کو کچل دیا جائے۔ انہیں خاردار تاروں کے کھلے باڑوں میں بند کر کے معاشی اور معاشرتی لحاظ سے بالکل تباہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ان کے بچوں کو حُر اسکول میں داخل کیا جاتا۔ جو ہاتھی کے دانت کی طرح کھانے اور دکھانے میں بالکل منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ حکومت کا مقصد صرف یہ تھا کہ نئی نسل کے ذہن میں پیر صاحب سے روگردانی اور بیزاری اور اس تحریک سے نفرت بھر دی جائے۔ لیکن یہ دونوں تجویزیں آخر کار ناکام ہوئیں اور

خود انگریز کو ہی یہ سرزمین چھوڑ کر جانا پڑا۔

آپ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک رتنا گری۔ مدنا پور۔ ڈھاکہ اور راجشاہی وغیرہ جیلوں میں رہے۔ آپ پر ناجائز ہتھیار رکھنے کا جرم عاید کر کے یہ سزا دیگئی تھی۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۰ء کو آپ کو پھر کراچی سے ناگپور جیل میں بھجوا دیا گیا۔ آخر آپ پر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت مقدمہ قائم کر کے یہ سزا دی گئی تھی۔

ذیل میں ہم ہفت روزہ "لیل ونہار" مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء صفحہ ۷ کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔ جس میں گذشتہ صفحات کا تقریباً خلاصہ موجود ہے:-

"ڈیڑھ سو برس پیشتر جب برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی عوامی تحریک مجاہدین کا آغاز ہوا تو سید احمد شہیدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ راجپوتانہ کے راستے سندھ ہوتے ہوئے شمال مغربی کہساروں کی طرف نکلے۔ تو سندھ میں پیر صاحب کے آباء ہی نے انہیں ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔ اور سندھ میں انہی کا گھرانہ ایک تحریک کا مرکز قرار پایا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں جب برطانوی سلطنت پر سورج غروب نہ ہوتا تھا، پیر صاحب (موجودہ پیر پاگارو) کے والد محترم نے برطانوی استعمار پر کاری ضرب لگانے کے لئے مسلح جدوجہد کا مجاہدانہ منصوبہ بنایا۔ یوں تو جنگِ عظیم کی ابتدا میں جب برطانوی افواج شکست میں گھری ہوئی تھیں۔ ہندو رہنما سبھاش چندر بوس نے جاپان کی مدد سے آزاد ہند فوج کے ذریعے مسلح جدوجہد کا اعلان کیا تھا۔ لیکن یہ نام نہاد آزاد ہند فوج مشرق کے نئے استعماریوں کی آلہ کار تھی۔ جبکہ سید صبغت اللہ شاہ شہید پیر پاگارو ششم کی جدوجہد کسی نئے استعمار کے بل بوتے پر نہ تھی، یہ خالص عوامی تحریک تھی۔ جس کی جڑیں برِصغیر میں تھیں۔ اور برِصغیر کے آزادی

کے متوالوں سے پیر صاحب کا رابطہ تھا۔ آزادی کا یہ عظیم مجاہدانہ منصوبہ قبل از وقت انگریزوں کے علم میں آ گیا۔ یورپ۔ شمال افریقہ۔ اور مشرق بعید میں پے در پے شکستیں کھاتے ہوئے برطانوی استعمار کے لئے آخری پناہ گاہ برطانوی ہندوستان میں تھی۔ ایسا منصوبہ ان کے لئے آخری وار ثابت ہو سکتا تھا جبکہ انہی دنوں جاپان کی فوجیں انڈونیشیا سے برما تک پورے جنوبی ایشیا کو روندتے ہوئے ہندوستان کے مشرقی صوبے آسام میں گھس آئی تھیں۔ برطانوی سامراجیوں نے پیر صاحب پاگارو سید صبغت اللہ شاہ کی تحریک کو نہایت بے دردی سے کچل دیا۔ آزادی کے متوالے مردانِ آزاد اُن کے مرید حُر کہلاتے ہیں جو حریت کی اس بے مثال تحریک میں قربانیوں کی داستان اور شجاعتوں کے قصّے تاریخ پر ثبت کرتے چلے گئے۔ حُروں نے گوریلا جنگ لڑی ان پر قابو پانے کے لئے پورے سندھ پر فوجی آپریشن ہوا۔ توپخانہ اور فضائیہ تک استعمال کی گئی۔ سید صبغت اللہ کو گرفتار کر لیا گیا ان کے مرکز پیر گوٹھ پر بمباری کی گئی اور پھر اُسے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیا گیا۔ پیر صاحب پاگارو ششم کو انگریز کی فوجی عدالت نے سزائے موت دیدی۔ مہینوں مارشل لا کے تحت مقدمہ چلتا رہا اور سزا کا فیصلہ کر لیا گیا۔ لیکن صرف چند گھنٹے پیشتر اس مردِ حق کو اسکی اطلاع دی گئی۔ کیونکہ انگریز سامراجیوں کو یقین تھا کہ اگر سزائے موت کا اعلان پہلے کر دیا گیا۔ تو حُر مجاہدین اپنی جان کی بازی لگا کر بھی پیر صاحب کو لے جائیں گے۔ اور کسی جیل کی دیواریں بھی حُر مجاہدین کے لئے ناقابلِ تسخیر ثابت نہ ہونگی۔ سید صبغت اللہ شاہ کو جب بتایا گیا

کہ چند گھنٹوں کے بعد انہیں پھانسی کے تختہ پر جانا ہے تو انہوں نے کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ نوافل ادا کیئے ۔ ان کے اعصاب کی مضبوطی اور اطمینان کا یہ عالم تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے فرمائش کی کہ وہ میرے ساتھ شطرنج کی آخری بازی کھیلیں۔ انہوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو تین بار مات دی اور اس سے کہنے لگے ۔ کہ تم پریشان ہو چکے ہو اسلئے اچھی طرح نہیں کھیل رہے ہو۔ اور نوافل پڑھنے میں مصروف ہو گئے ۔ پھانسی کے مقررہ وقت سے ذرا پہلے عبادت ختم کی اور جب وقت ہو گیا تو خود سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وقت ہو گیا ہے۔ اب چلنا چاہئے سپرنٹنڈنٹ جیل نے جسکی نگرانی میں پیر صاحب کو پھانسی دی گئی۔ بعد میں لکھا ہے کہ اس نے پوری زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے موت کو دیکھکر ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا ہو۔ اور جس کے اعصاب سزائے موت سننے کے بعد بھی اتنے ہی مضبوط رہے ہوں کہ وہ شطرنج کھیلنے میں لطف محسوس کرتا ہو ۔ بلاشبہ اللہ پر مضبوط ایمان کے بعد ہی موت سے بے خوفی کی یہ کیفیت ممکن تھی ۔

سید صبغت اللہ شہید ہو گئے ۔ حُر تحریک کچل دی گئی ۔ لیکن انہوں نے انگریز سامراج کو جھنجھوڑ دیا کہ ابھی مسلمان کے خاکستر میں ایسی چنگاری بھی موجود ہے ۔ نہ صرف یہ ہوا بلکہ انہوں نے سندھ کا نام روشن کیا اور انگریز سامراجیوں کے اس پروپیگنڈے کو بھی غلط ثابت کر دیا کہ اہلِ سندھ فوجی صلاحیتوں سے عاری ہیں ۔ حُر تحریک سندھیوں کے جنگجو بلکہ بہترین جنگجو ہونے کا ثبوت ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز پیر صاحب پاگارو ششم سید صبغت اللہ کو شہید کرنے پر مطمئن نہ ہوا ۔ بلکہ مرکزِ تحریک کو تباہ

کرنے کے علاوہ گدّی کے ختم کرنیکا بھی اعلان کیا گیا۔"

مرشد اور مرید

اس عنوان کا تعلق صرف حضرت شہیدؒ سے ہی وابستہ نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد اس گدی کے طالبین کا وہ تعلق ظاہر کرنا ہے جو ہر پیر پاگارو سے ان کے مریدوں کو شروع سے رہا ہے اور آج تک بدستور قائم ہے۔ بلکہ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی تک نہیں آئی۔

ہر مسند کے بزرگوں اور ان کے عقیدت مندوں کے درمیان چند ایسے حدود و قیود ہوتے ہیں جو انہیں دوسری گدیوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اگرچہ ہر مرید کو اپنے مرشد سے بے حد عقیدت ہوتی ہے۔ اور جب تک یہ عقیدت نہ ہوگی اس کا مرشد سے فیض حاصل کرنا یا روحانی مدارج طے کرنا امر محال ہے۔

اسی کا نام فنا فی الشیخ ہے۔ لیکن حُروں کو اپنے مرشدوں سے جو عقیدت رہی ہے اسکی مثال دوسرے سلسلوں میں شاذونادر ہی ملتی ہے۔ اس سے متاثر ہوکر بعض لوگوں نے اس کا نام BLIND FAITH رکھدیا ہے۔

مرید اپنے مرشد کے سامنے سر جھکائے دوزانو بیٹھتا ہے۔ بغیر ضرورت ہرگز نہیں بولتا۔ اور مرشد کے ہر اشارے پر عمل کرنے کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے لیکن حُروں کی یہ حالت ہے کہ جس سڑک پر سے پیر صاحب کی موٹر گذرنے والی ہوتی ہے اس پر پہروں ان کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ جوتا اتار لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں جوتے پہنکر مرشد کے استقبال کیلئے کھڑا رہنا بے ادبی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بھیج پاگارو کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ انہیں اکثر اوقات سردی گرمی بھوک پیاس اور رات کی تاریکی کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کی عقیدت قابلِ داد ہے کہ جب تک مرشد کی زیارت نہیں ہوجاتی وہ واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ سفر میں جہاں مرشد کا قیام ہوگا، وہاں یہ عقیدت مند بیل گاڑیوں

پر سوار ہو کر دور دراز سے سفر کر کے آتے ہیں۔ اور ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ پیر صاحب کا میزبان ان عقیدت مندوں کے لئے چاول کی دیگیں پکاتا اور سب کو کھلاتا ہے۔ خواہ ان کی تعداد کتنی ہی ہو۔ اور خواہ انہیں کتنے ہی دن تک رہنا پڑے۔

پیر صاحب کے لئے ایک چبوترہ نہایت اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے جسے سندھی زبان میں "پیر جو تھلو" کہتے ہیں۔ جب پیر صاحب کی زیارت کا اعلان کیا جاتا ہے تو سب عورتیں اور مرد اس چبوترے کے سامنے حلقہ باندھکر کھڑے ہو جاتے ہیں جب پیر صاحب اس چبوترے پر تشریف لاتے ہیں تو بھیج پاگارا کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ اور حاضرین دیوانہ وار نذرانوں کی بارش برساتے ہیں۔ حتیٰ کہ عورتیں اپنے زیور تک پھینک دیتی ہیں۔ پیر صاحب چند منٹ تک کھڑے رہتے ہیں۔ پھر موقع کی مناسبت سے وعظ ونصیحت کے چند جملے ارشاد فرماتے ہیں انہیں مختلف ہدایات دیتے ہیں۔ اور ان کے لئے دعا کرنے کے بعد واپس اپنی قیام گاہ میں تشریف لے جاتے ہیں۔ ایسے ہجوم میں بھی نظم و ضبط اور آداب کا پورا خیال کیا جاتا ہے۔ چوری وغیرہ بالکل نہیں ہوتی۔ زیارت کا انتظام عموماً آپ کے خلفاء کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہی دعوت دیتے ہیں۔ پورے سندھ میں خلفا کا نظام قائم ہے۔ اور ہر حلقے کے لئے انہیں خود پیر صاحب نامزد کرتے ہیں۔ وہ آپکی ہدایات مریدوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کی معروضات پیر صاحب کے گوش گذار کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

حضرت سیدشاہ مردان شاہ اول کی وفات تک مریدوں کی روحانی اصلاح وتربیت کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد چونکہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانی کم عمر تھے۔ اور پھر ان کا زیادہ عرصہ جیلوں میں گذرا اور اس

کے بعد انہیں شہید کردیا گیا۔ اسلئے اس دوران یعنی تقریباً ربع صدی تک ان کی سیرت
وکردار کی طرف مناسب توجہ نہ دیجا سکی اور نیز حالات کا تقاضہ انہیں سپاہیانہ
زندگی گذارنے پر مجبور کرتا رہا۔ اس لئے یہ جماعت روحانی کم اور عسکری زیادہ تھی
اور یہ حالت ۱۹۵۰ء تک رہی پھر جب موجودہ پیر پاگارہ حضرت سید سکندر شاہ
المعروف بہ سید شاہ مردان شاہ ثانی لندن سے واپس لائے گئے اور انہوں نے
تھوڑی سی مدت میں دینی اور روحانی مدارج طے کرلیے تو یکسوئی سے جماعت کی
تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ جن لوگوں سے حکومت سندھ نالاں تھی
انہیں قانونی کارروائی کے لئے حکومت کے سپرد کیا گیا کیونکہ اب یہ بدیسی حکومت
نہ تھی بلکہ اہلِ وطن کی حکومت تھی اور ان کے لئے دردِ سر ثابت ہونا کسی طرح بھی
معقول اور جائز نہ تھا۔ آپ کی توجہ اصلاح اور تنظیم کی بدولت رفتہ رفتہ جماعت
میں زندگی اور تعمیر کے آثار پیدا ہوئے۔ آپ نے نہایت سختی سے مریدوں کو لغویات
اور غیر قانونی حرکات سے منع کر دیا۔ اور خود اپنا نمونہ ان کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ
ہر زیارت کے موقعہ پر آپ خطبہ دیتے اور لوگوں کو سیرت وکردار کی صفائی کے لئے
ترغیب دیتے ہیں۔ اور عسکری اسپرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے آپ نے خود ۱۹۶۵ء
اور ۱۹۷۱ء میں تھرپارکر کے ان علاقوں میں اپنا کیمپ لگایا۔ جو دشمن کی زد میں
تھے تاکہ آپ کے عقیدت مند آپ کی رہنمائی میں پاکستانی افواج کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ
آپ کا طرۂ امتیاز ہے کیونکہ سندھ کے دوسرے پیرانِ عظام میں سے کوئی بھی محاذِ
جنگ میں خود حاضر نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی جماعتیں محراب ومنبر تک ہی محدود
رہیں۔ اس جماعت کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ بہادر اور جری ہوتے کے ساتھ
ساتھ امن پسند بھی ہے ابھی سالِ گذشتہ سے پیشتر سرزمین سندھ کو مفسدوں
کی سازشوں کی وجہ سے لسانی ہنگاموں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو یہ جماعت ان سے بالکل بے تعلق رہی بلکہ انہوں نے

ہر جگہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے اپنے مرشد کے ہرادنی واعلیٰ حکم پر لبیک کہا اور یہی اخوت اور محبت کا کرشمہ تھا کہ تھرپارکر اور سانگھڑ میں مفسدوں کی سب سازشیں ناکام ہوگئیں۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ نئے اور پرانے سندھیوں میں یہ جماعت رابطہ عیم کا کام سرانجام دیتی رہیگی اور ان کی کوششوں سے یگانگت اور مروت کے سدابہار پھول کھلکر اپنی بہار جانفزا سے دل ودماغ کو معطر کرتے رہیں گے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ اور لسانی اور علاقائی تعصبات اسے آنکھوں سے اندھا۔ کانوں سے بہرا اور عقل سے کورا نہیں کر سکتے۔ خواہ پروپیگنڈہ مشینری کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو۔ لیکن ایمان کی رمق رکھنے والے اپنے بھائیوں میں فتنہ پیدا کرکے اس آگ میں خود جلنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے :۔ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

ہمیں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ قیام پاکستان کے وقت جب مہاجرین کا سیلاب آرہا تھا۔ اس جماعت کے افراد نے بھی انکی دل کھول کر مدد کی ہے۔ اور انہیں اپنا بھائی سمجھکر خود کو صحیح معنوں میں انصار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ اضلاع سانگھڑ اور نواب شاہ کے مہاجر کیمپوں میں ان کی خدمات تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہیں۔ اور یہی جماعت تھی جس نے لسانی ہنگاموں میں فضا کو پرسکون رکھنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ان سب خدمات کا کریڈٹ (CREDIT) بھی اس عظیم المرتبت خانوادہ کے کھاتے میں جمع ہوتا ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں ہرگز باک نہیں ہے۔ کہ موجودہ پیر پاگارد واقعی امن اور سلامتی کا مظہر ہیں۔ جن کے پیش نظر وطن کی سلامتی۔ اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں میں یگانگت اور بھائی چارہ کا قیام ہے۔ اور اس میں وہ بفضل خدا کامران وکامگار ہیں۔ ہم حضرت پیر صاحب کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

باب ششم

"دی ٹیرارسٹ" کا مصنّف

اور

حضرت پیر شہید رح

پیر شہید اور ایچ - ٹی لیمبرک

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

(اقبال)

زندہ قومیں مجاہدین آزادی کو سر آنکھوں پر بٹھاتی اور دلوں میں جگہ دیتی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ مقدس اور مبارک ہستیاں ہیں جو اپنے گرم گرم خون سے آزادی کے سدا بہار پھولوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔ وہ دوسروں کی آبادی کے لئے اپنی بربادی کو ہنسی خوشی قبول کرتی اور وطن کی بہو بیٹیوں کے سہاگ برقرار رکھنے کے لئے خود تختۂ دار پر چڑھ جاتی ہیں۔ ان کی موت دوسروں کی حیات کا باعث ہوتی ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سرزمینِ سندھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے مجاہدینِ آزادی کے علمبردار حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت سید اسمٰعیلؒ کے قدوم میمنت لزوم چومے اور ان کے چھوڑے ہوئے اثرات کو تقریباً ایک صدی تک اس شان سے زندہ و تابندہ رکھا کہ فرنگی

حکمرانوں کے ایوان لرز اٹھے ۔ حضرت سید صبغت اللہ شاہ اول ؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک آزادی کا جو چراغ سندھ میں روشن کیا تھا اسکی ضو بڑھتے بڑھتے اسقدر پھیلی کہ اس سے برصغیر کی تاریخ کے اوراق جگمگا اٹھے اور انگریزوں کی آنکھیں چندھیا گیئں ۔ آزادی کے اس چراغ نے تیل کی جگہ حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ سے ان کا خون حاصل کیا ۔ اور صرف چار سال بعد ہی مسلمانوں کے خوابوں کی دنیا پاکستان قائم ہوگیا ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غیر ملکی جبر واستبداد جہاں اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے وہاں پوری قوم کی غیرت کا خون چوس لیتا ہے اور پٹھوؤں کی پرورش کر کے صدیوں تک اسکی عزت و ناموس سے کھیلتا رہتا ہے ۔ یہی حال ہندوستان کا تھا ۔ جہاں انگریز تقریباً ایک صدی تک حکومت کے نشہ میں خرمستیاں کرتا رہا اور جی حضوریوں کی ایک فوج اس کے سنگھاسن کی محافظ رہی ۔

ایسے حالات میں آزادی کا خواب دیکھنا شیوۂ مردانگی ہے ۔ لیکن جو حصول آزادی کے لئے خم ٹھونک کر اس دیو استبداد کے مقابلے پر آجائے اسے غیر ملکی تو بے شک غدار ۔ باغی ۔ دہشت پسند اور ظالم کہہ سکتے ہیں لیکن جب قوم کا ضمیر زندہ ہو جاتا ہے تو وہ قوم کے لئے چشم و چراغ ہیرو اور مجاہدین بن جاتے ہیں جن پر صدیوں ناز کیا جاتا ہے ۔

افسوس ان دانشوروں پر ہے جو آزادی کے ان پروانوں کو اب تک بھی دہشت پسند کہتے ہیں ۔ اغیار کو ان پر طعنہ زن ہوتے دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں ؎

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانہ کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

مگر کیا کہیں کہ زمانے کا دستور یہی رہا ہے کہ ؎

وہ اٹھتا ہوا سا دھواں اوّل اوّل
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفان صحرا میں اوّل
غبارِ رہِ کارواں آخر آخر

* * *

کاش لوگوں نے میاں محمد شفیع کی کتاب ۱۸۵۷ء پڑھی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو کون تھے اور انہوں نے برصغیر کی آزادی کے لئے کیا کیا۔

شاید ہم بھی خاموش رہتے لیکن حُر مجاہدین کی سسکیاں سنکر اضطراب نے انگڑائی لی۔ کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا ؎

یا دوستوں میں مہر و محبت نہیں رہی
یا میری زندگی میں صداقت نہیں رہی

یہ سرگوشی ایک کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جسے فرنگی عہد کے ایک ڈسٹرکٹ آفیسر ایچ۔ ٹی۔ لیمبرک نے لکھا اسے "دی ٹیرارسٹ" کا نام دیا اور لندن ارنسٹ بین لمیٹڈ نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ اور ہمیں یہ کہنا پڑا ؎

ہم تو راضی تھے ختم کرنے پر
بات یاروں نے خود بڑھائی ہے

ہو گئے اشکبار کیوں شفقتؔ
کون سی بات یاد آئی ہے!

لیمبرک حیدر آباد کا ڈسٹرکٹ آفیسر بھی رہا تھا لیکن بعد میں وہ حُروں کے متعلق تمام امور کا ناظم بن گیا۔ اس نے حیدر آباد سنٹرل جیل میں حضرت پیر شہیدؒ سے شطرنج کی بازی بھی کھیلی تھی۔ (ایک روایت ہے کہ وہ مسٹر کوپر تھے ـ مصنف)

یہ کتاب لکھی گئی ہے یا لکھوائی گئی ہے۔ اس کا جواب خود لیمبرک نے صفحہ ۱۱ پر

دے دیا ہے کہ :-

"۱۹۶۷ء میں انڈین پولیس ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ نے اس سے التجا کر کے لکھوائی ہے"

ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھوانے میں اپنوں کا بھی حصّہ ہو - اگرچہ اسکی وجہ لیمبرک نے محض "تاریخ میں اضافہ" قرار دی ہے لیکن اس پردۂ زنگاری میں جو معشوق بول رہا ہے وہ پاکستانی افواج کے ہاتھوں ۱۹۶۵ء میں انڈین آرمی کی ذلت آمیز شکست ہے جس میں حُر مجاہدین نے سانگھڑ - نفر پارکر - خیرپور اور رحیم یارخاں وغیرہ اضلاع کی سرحدوں میں وہ کارنامے سرانجام دیئے تھے کہ ہندو آرمی کے بڑے بڑے کمانڈر بوکھلا اُٹھے تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف لیمبرک نے بارہا اپنی کتاب میں خود کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ان مجاہدین سے خاطر خواہ کام نہ لینے کی وجہ سے ان سرحدوں پر پاک آرمی کو نقصان اٹھانا پڑا ہے -

انڈین پولیس کے سابق پریذیڈنٹ نے یہ کتاب لکھوا کر حُر مجاہدین کو کچلنے اور آئندہ ان کی یلغار سے محفوظ رہنے کے لیئے جو پروگرام بنایا تھا اس کا اشارہ کتاب کے نام "دی ٹیرارسٹ" (دہشت پسند) سے ہی مل جاتا ہے اور افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۷۲ء سے لیکر ۱۹۷۵ء تک کسی پاکستانی بالخصوص کسی سندھی دانشور نے اس کا جواب دینے کی زحمت نہیں اٹھائی اور "قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند" کی چوٹ اس ناچیز کے دل پر پڑی - جس سے اٹھنے والی ٹیسوں کو "تذکرۂ پیرانِ پاگارہ" کے نام سے میں نے جامۂ الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

لیمبرک کی کتاب میں مندرجہ ذیل الزام لگائے گئے ہیں :-

(۱) پیر صبغت اللہ شاہ ثانیؒ دہشت پسند تھے ۔ کانگریس کے پٹھو تھے ۔ اور ان کے کردار پرچند بدنما دھبے تھے ۔

(۲) حُر دہشت پسندوں ۔ قاتلوں اور ڈاکوؤں کی ایک جماعت تھی ۔

(۳) یہ سب سلطنتِ انگریز کے غدار تھے ۔

(۴) انگریزوں نے ان کو کچل کر ہندوستان پر بڑا احسان کیا ہے ۔

یہ ۲۴۶ صفحے کی کتاب ہے جس کی قیمت پاکستان میں ۷۵ روپیہ ہے سرورق پر پیر شہیدؒ کی تصویر اس طرح بنائی گئی ہے کہ دہشت پسندی کا چونکا دینے والا مرقع ہے ۔ اور قتل و غارت وغیرہ کے نقوش بڑے جاذب ہیں ۔ اس کتاب کی بنیاد حضرت شہیدؒ کے ایک مُرید سائیں رکھیو ولد دالی ڈنو ذات خاصخیلی ساکن تعلقہ سنجھورو ضلع سانگھڑ کے زبانی بیان پر رکھی گئی ہے جسے ۲۵ ؍ مارچ ۱۹۴۶ء کو عثمان ہنگورو (میرپور خاص اور کھپرو روڈ پر واقع ایک قصبہ) سے اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب کہ اس کے دو ساتھی (شیر دل) اللہ بچایو اور رستم نظامانی ملٹری اور پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے ۔ اور جسے وہاں سے سنجھورو جیل میں منتقل کیا گیا تھا ۔ یہ شخص دوسرے درجے کا نائب تھا ۔ ان پڑھ اور غیر سیاست داں لیکن اس کے باوجود پیر سائیں کا زیر دست عقیدت مند ۔ بہادر اور جنگجو تھا سنجھورو جیل میں اپنے ساتھیوں کے نام اس کا آخری پیغام جسے ۲۰ ؍ فروری ۱۹۴۷ء کو مسٹر اٹیلی نے برٹش پارلیمنٹ میں پڑھ کر سنایا تھا اور جسے لیمبرک نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۸ پر درج کیا ہے اس کے کردار کی عکاسی کرتا ہے ۔ ہم ذیل میں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں :-

" دوستو ۔ میری اس جانگداز جدوجہد کا نتیجہ آخر کار ہمارے حضرت

پیر سائیں کی فتح وکامرانی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ انگریز جلد ہی اپنا بوریا بستر باندھکر ہندوستان سے رخصت ہو جائے گا۔ اور نظامِ حکومت بالآخر ہمارے ہی ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں آ کر رہے گا۔ میں سندھ اسمبلی کے ان ممبروں کو بھی بتا دینا چاہتا ہوں جو ہماری جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لئے انگریز کے آلۂ کار بن گئے ہیں کہ تم زیادہ دنوں تک ہم پر ظلم وستم کی مشق جاری نہ رکھ سکو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ انگریز کے یہ پٹھو اور فرنگی حکومت کے گورنر، کمشنر اور دوسرے آفیسر پیر سائیں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور قوت سے خائف ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ سرزمینِ سندھ پر حضرت پیر سائیں کا سایہ قائم رہے۔ لیکن انگریزوں کا آخری وقت آگیا ہے۔ وہ چلے جائیں گے۔ اپنے ہم وطنوں کو ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے رہیں گے۔ انشاء اللہ پیر سائیں واپس آئیں گے۔ ممکن ہے میں اس یوم مسرت کی صبح دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں۔ کیونکہ میرا جسم چُور چُور ہو گیا ہے۔ تاہم میرا عزم ابھی تک جوان ہے اور تمہیں کہتا ہوں کہ آگے بڑھکر ہمارا مشن جاری رکھو اور دیکھو پیر سائیں کا یہ پیغام (چکنائی سے تر کردہ کاغذ جس میں خفیہ پیغام اور زمینوں اور اسلحہ کے ذخیروں کی نشاندہی کی گئی تھی) رحیم بادشاہ کو پہنچا دینا۔ میری طرف سے اُسے مبارکباد دینا اور کہنا کہ میں اپنے عہد وپیمان پر قائم ہوں۔ بے شک تحقیق کرکے تسلی کر لینا۔ اور اگر پیر سائیں آ جائیں تو انہیں بتا دینا کہ میں نے رستم نظامانی۔ اللہ بچایو شیر دل۔ نورو وسان۔ امام بخش۔ نقمان۔ ابراہیم

اور ایسے ہی دوسرے کئی غازیوں کے ساتھ مل کر ان کے مشن کو جاری رکھنے کے لئے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

اگرچہ اب میری لاش کسی گمنام قبر میں ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا نام زندہ رہیگا۔"

اب ہم سلسلہ وار لیمبرک کے عائد کردہ الزامات کا جائزہ لیتے ہیں:۔

(۱) لیمبرک کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پیر سائیں کو دہشت پسند کہے کیونکہ حضرت پیر سائیں کے جذبۂ جہاد کی وجہ سے لندن کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا تھا اور سندھ میں انگریز کو اپنا سنگھاسن ڈولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ غیر ملکی استبداد آزادی کے پروانوں کو ہمیشہ غدار۔ باغی۔ دہشت پسند اور ایسے ہی مکروہ القاب دیکر اپنے ظلم و ستم کو چھپایا کرتا ہے۔ لیکن آزادیٔ وطن کے یہ ہیرو شمع آزادی کی جوت جگاتے ہیں۔ مجاہد۔ غازی۔ محسن اور شہید بن جاتے ہیں۔ اس لئے لیمبرک کا یہ الزام دراصل حضرت سائیں کی اہمیت۔ قوت اور مشن کی برتری کا روشن ترین ثبوت ہے۔

لیمبرک کہتا ہے کہ حضرت پیر سائیں کانگریس کے پٹھو تھے۔ اور ثبوت میں سائیں رکھیو کے مختلف بیانات کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن الزام بھی بودا — اور بے حقیقت ہے کیونکہ سائیں رکھیو کوئی سیاست داں نہ تھا بلکہ صرف مجاہد تھا۔ اسے سیاسی چکروں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ لیمبرک نے جہاں چاہا ہے اپنی مرضی سے بیانات میں ردّ و بدل کر دیا ہے۔ کیونکہ اُسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اور سائیں رکھیو فوت ہو چکا تھا۔ لیکن اگر ان سب باتوں کو درست تسلیم کر لیا جائے تو بھی لیمبرک اپنے مشن میں اس لئے ناکام رہتا ہے کہ پیر سائیں کی حیثیت سندھ میں بے تاج بادشاہ کی سی تھی۔ اُن کے مریدوں کی تعداد بیس لاکھ سے متجاوز تھی اور سندھ

راجپوتانہ ۔ بہاول پور اور بلوچستان کے دور دراز گوشوں تک ان کے نام لیوا موجود تھے ۔ جو حضرت سائیں کے ادنیٰ اشارہ پر جان کی قربانی کرنا عین سعادت سمجھتے تھے ۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایسی شان و شوکت ۔ رعب و دبدبہ ۔ قوت و اقتدار اور اثر و رسوخ والی معزز شخصیت کانگریس سے اس لئے گٹھ جوڑ کرنے پر آمادہ ہو جائے کہ اسکی اہمیت اور بڑھ جائے گی ، یہ تو سراسر الٹی منطق ہے حالانکہ تصویر کا اصلی رُخ یہ ہے کہ کانگریس حضرت پیر سائیں کی نظر کرم اور ان کے دست تعاون کی متمنی تھی تاکہ سندھ میں اسے خاطر خواہ کامیابی ہو سکے جہاں کے مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے شاندار کارنامے سرانجام دے رہے تھے ۔ کانگریسی لیڈر جانتے تھے کہ اگر حضرت پیر سائیں جیسا شہباز اُن کے دام میں آجائے تو سندھ میں مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے ساتھ ساتھ انگریز سے مُنہ مانگی مُراد حاصل کی جا سکتی ہے ، اس لئے وہ اکثر حضرت پیر سائیں کے درِ دولت پر منڈلاتے رہتے تھے ، اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خود لیمبرک نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۴ پر سائیں رکھیو کے حوالے سے لکھا ہے کہ جنوری ۱۹۴۶ء میں نہرو سندھ میں آیا اور حیدرآباد کے بازار میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس نے اعتراف کیا کہ حُروں نے جنگ آزادی میں بڑے بڑے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں ۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے مشاہیر ۔ کانگریسی لیڈر اور صحافی کھُلے الفاظ میں اقرار کرتے تھے کہ حُر جنگ آزادی کے مجاہد ہیں اور انگریز ان پر ناروا ظلم و ستم کر رہے ہیں ۔

دراصل ہندو سندھ میں مسلم لیگ کے غلبہ سے خائف تھا اور چاہتا تھا کہ پیر سائیں کو اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنائے لیکن حُسینی جذبہ کا یہ مظہر ۔ سلسلۂ پیران پاگارہ کا روشن چراغ ، اور نہایت مضبوط عزم و ارادہ رکھنے والا ... ہی اعصاب کا انسان ہندو کی قیادت کو کسی صورت میں قبول کرنے کے لئے تیار

نہیں تھا۔ اس لیے کانگریسی لیڈروں کے سب تیر خطا گئے اور کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق لیمبرک نے انڈین پولیس کے پریذیڈنٹ کو خوش کرنے کے لئے حضرت سائیں پر بار بار یہ الزام لگایا ہے کہ وہ کانگریس کے پٹھو تھے اور جا بجا سائیں رکھیو کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ حضرت سائیں کانگریس سے تعاون کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کی اہمیت بڑھ جائے۔ یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ جس شخص سے خود انگریز خائف تھا اسے خواہ مخواہ کانگریس کی جھولی میں ڈالنے کی ناکام کوشش کی جائے جبکہ کانگریس صرف سیاست دانوں کا ایک ٹولہ تھا۔ اور حضرت پیر سائیں مجاہدینِ آزادی کے سالارِ اعظم تھے۔ ان دونوں کی راہیں علیحدہ علیحدہ تھیں اسلئے ان کے اشتراکِ عمل اور تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کانگریس حُروں سے خوفزدہ تھی اِسلئے وہ انہیں انگریز سے لڑوانے کے لئے منافقت سے کام لے رہی تھی تاکہ مسلمانوں کا یہ گروپ تباہ ہو جائے اور اس کی ذمہ داری انگریزوں کی گردن پر ہو۔

لیمبرک نے حضرت پیر سائیں کے کردار پر بدنما چھینٹے ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ ناکام رہا ہے۔ کیونکہ اس نے سائیں رکھیو کی بہن جنڈی اور ایک نوعمر لڑکے یارو کو اس انداز سے پیش کیا ہے گویا حضرت سائیں کے دل پر بس انہی کی حکمرانی تھی۔ حالانکہ جنگ آزادی کے پس منظر کو نگاہ میں رکھنے والا ہر ذی ہوش یہ جانتا ہے کہ حضرت پیر سائیں کی زندگی کا بیشتر حصہ جیلوں میں گذرا ہے۔ اور باقی اوقات حُروں کی عسکری تنظیم کی تربیت کے ساتھ ساتھ سیاسی شاطروں سے نوک جھونک میں بسر ہوئے ہیں۔ نیز سرفروشوں کی لغت میں اس قسم کی عیاشی کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ یارو ایک نوعمر لڑکا ہے جسے غازیوں میں شامل کرنے کے لئے مناسب تربیت دی جاتی ہے اور جنڈی ایک موقع پر حضرت پیر سائیں کے قدم فرطِ عقیدت سے چُوم لیتی ہے۔ بس اتنی سی بات تھی جسے اغیار نے افسانہ کر دیا

نکہ دشمن اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ہر قسم کے الزام لگاتا ہے تاکہ بار بار اس کا پروپیگنڈا کر کے مخالف کو بدنام کیا جا سکے ۔ چونکہ کوئی فہمیدہ شخص اس قسم کی باتوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھتا اس لئے ہم خواہ مخواہ اس بحث میں الجھنے کی بجائے صرف یہ کہتے ہیں کہ :-

خون قتیلِ بے سروپا را بپائے خویش

مالید - آں نگار و حِنا را بہانہ ساخت

حضرت پیر سائیں کے علاوہ حُر مجاہدین پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ دہشت پسندوں ۔ قاتلوں اور ڈاکوؤں کی ایک جماعت تھی ۔ اس پر ہمیں بے اختیار کسی کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

انگریز بہادر کشت و خون کرے تو مصلح ۔ کسی ملک پر غاصبانہ قبضہ کرے تو شہنشاہ ۔ کسی قوم کی آزادی سلب کرے تو جمہوریت پسند اور دوسروں کو لڑوا کر حکومت کرے تو سیاست داں کہلاتا ہے ۔ اس کے بلند اقبال کی دعائیں کی جاتی ہیں "خدا شہنشاہِ معظم کو سلامت رکھے" کا ترانہ پڑھایا جاتا ہے ۔ اس کی عقل و دانش کے قصیدے لکھے جاتے ہیں ۔ لیکن اگر غیر ملکی تسلّط کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے مجاہدین سر پر کفن باندھ کر میدان میں نکل آئیں تو وہ غدّار ۔ باغی ۔ دہشت پسند ۔ قاتل اور ڈاکو کہلائیں ۔ یہ ہے لیمبرک صاحب کی اُلٹی منطق ۔ جو ۱۹۴۷ء میں وطن واپسی کے بعد بھی ۱۹۷۲ء تک بدستور بطور نسخہ کیمیا استعمال کی جاتی رہی ہے ۔ مگر جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے ۔ حُر مجاہدین کی بہادری ۔ اولوالعزمی ۔ استقلال عظمت ۔ سرفروشی اور جذبۂ جہاد کی تعریف کئے بغیر لیمبرک کے لئے کتاب مکمل

کرنا ممکن نہ رہا اور اس نے جابجا اس کا اعتراف کیا ہے بلکہ وہ اس جماعت کی بہادر خواتین کو بھی خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہوا ہے لیکن چونکہ انگریز تھا اور انگریز کو برصغیر سے بسترہ باندھکر نکلنا آج تک کانٹے کی طرح چبھتا ہے اس لئے وہ ان مجاہدوں کو دہشت پسند کہکر اپنے دل کا غبار نکالتا ہے۔

اگر حُر مجاہدین نے اپنے کسی ہم وطن کو قتل کیا ہے تو اسکی وجہ خود لیمبرک نے بھی یہی بتائی ہے کہ یا تو وہ جماعتِ مجاہدین سے منحرف ہوگیا تھا یا اس نے جاسوسی کی تھی یا مجاہدین کی جدوجہد میں روڑے اٹکائے تھے اور اگر چند ڈاکو حُروں کے رُوپ میں کہیں نظر بھی آتے ہیں تو اس سے جماعت کو مطعون نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ابن الوقت اور موقع پرست (OPPORTUNISTS) اسی طرح فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ الزام لگانے والے بھی کیا خوب ہوتے ہیں۔ کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

حُر مجاہدین بے شک انگریزی حکومت کے غدار تھے اور اس پر انہیں فخر بھی ہے کہ جب لوگ خان بہادر اور رائے صاحب بن رہے تھے۔ وہ وطن کی آزادی کے لئے عملاً جانفروشی کا سبق دے رہے تھے۔ وہ انگریز کے غدار لیکن سرزمینِ سندھ کے وفادار تھے اور انگریز نے انہیں کچل کر ہندوستان پر احسان نہیں کیا بلکہ بہترین سپوتوں سے ملک کو محروم کر دیا۔ اور ان کے خلاف غلط پروپیگنڈا کر کے ان کی شہرت کو ہمیشہ کے لئے داغدار کر دیا۔

آخر میں ہم لیمبرک کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے "دی ٹیرارسٹ" لکھکر ہمیں ایک موقع فراہم کیا کہ ہم سرزمین سندھ کے ان سپوتوں کا تذکرہ کتابی تشکل میں اپنے اہلِ وطن کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ جن کے مرشدوں نے

کئی صدیوں تک اس خطۂ پاک میں تصوّف کی شمعیں روشن رکھیں ؎

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیمِ جانفزا
پھر میسّر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مطربِ رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا

باب ہفتم

اس خاندان کی خدمات
کا
ایک جائزہ

علمی ادبی اور دینی خدمات

اس خاندان کے تقریباً تمام افراد علمی اور ادبی لحاظ سے بلند مقام کے حامل ہیں۔ اکثر و بیشتر صوفیائے کرام میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت سید علی لکیاری سے لیکر حضرت سید محمد بقا تک کے بزرگوں کی علمی و ادبی کاوشوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس کے بعد سے آج تک ان بزرگوں نے علم و ادب کے معاملے میں جو کچھ کیا ہے اس کا ایک دھندلا سا عکس ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت سید محمد راشد المعروف بہ "روضے دھنی" آپ بہت بڑے عالم تھے اور جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ آپ کے علم و ادب اور اصلاح و تربیت کی بدولت لاکھوں افراد نے ہدایت حاصل کی۔ آپ کے ملفوظات آج تک بڑی عقیدت سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور ان کی افادیت میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی۔ بلکہ جوں جوں لادینی تحریکوں کا فتنہ ابھرے گا۔ ان ملفوظات کی قدر و قیمت بڑھتی ہی جائے گی۔ کیونکہ جو شخص ان کا مطالعہ کرتا رہیگا وہ اس دورِ پُرفتن میں بھی انشاء اللہ ہدایت کی راہ سے نہیں بھٹکے گا۔

ان ملفوظات کی مثال چکی کی کیل کی طرح ہے کہ جو دانہ اس کیل کے پاس رہتا ہے وہ سالم رہتا ہے اور جو اس سے دور ہٹ جاتا ہے وہ پس جاتا ہے لادینی

فتنوں میں اپنا ایمان بچانے کے لئے ان ملفوظات کو کیل سمجھکر ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آپ کی دوسری کتابوں کے نام ہم نے آپ کے تذکرے میں بیان کئے ہیں جن سے آپ کی علمی وادبی خدمات کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

حضرت پیر صبغت اللہ شاہ اول المعروف بہ پیر پاگارہ

آپ میر علی مراد خاں والئی خیرپور کے ہم عصر تھے۔ اور اسوقت سندھ میں صرف یہ دو خاندان ایسے تھے جنہیں علم دوست کہا جا سکتا تھا۔ اس لئے ان دونوں کے آپس میں دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ حضرت پیر صاحب دینی نقطۂ نظر سے روشن خیال اور سیاسی طور پر آزادی پسند تھے۔ آپ کے ان منصوبوں سے مولوی قاضی حاجی محمد عثمان ساکن کھاہی راہو نزد نوشہرہ فیروز ضلع نواب شاہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت پیر صاحب نے سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے جو دستے تیار کئے تھے ان میں سے ایک دستہ میں حاجی محمد عثمان بھی شامل تھے جب سندھی مجاہدوں کا یہ دستہ منزلِ مقصود پر پہنچا تو انہیں معلوم ہوا کہ آزادی کے علمبردار حضرت سید احمد شہید اور حضرت سید اسماعیل شہید دونوں ہی بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوچکے ہیں اور مجاہدین کے عساکر منتشر ہوکر رہ گئے ہیں۔ اس لئے یہ دستہ واپس آگیا۔ حاجی صاحب اس دستہ میں شامل ہوکر اپنے ساتھ جو اسلحہ جنگ لیکر گئے تھے ان میں سے ایک تلوار اور ایک خنجر اب تک آپ کے خاندان میں بطور یادگار محفوظ ہے۔

یہ حاجی صاحب بھی حضرت پیر صاحب کی علمی خدمات کا جیتا جاگتا شاہکار تھے کیونکہ آپ کی تحریروں اور تقریروں نے ہی حاجی صاحب میں جہاد کی روح پھونک دی تھی۔ آپ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے اور اپنے علم وفضل سے طالبانِ حق کو بہرہ ور فرماتے رہتے۔ آپ ہر روز بعد نماز فجر مسجد شریف میں قرآن پاک کا درس دیتے اور بعد نماز ظہر مثنوی مولانا روم کے اسرار اور رموز کے نکات بیان فرماتے

پیر علی گوہر شاہ اصغر بنگلہ دھنی رح

آپ ۴ رجب المرجب ۱۲۳۱ھ کو تولد ہوئے اور اپنے والد حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ اول رحمت اللہ علیہ کی رحلت کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ آپ اپنے علم و فضل روحانی فیض اور سخاوت کی وجہ سے سندھ اور ہند میں مشہور رہوئے۔ آپ کو عربی اور فارسی علوم پر ملکہ تھا علماء اور شعراء آپ کی خدمت میں آتے اور انعام واکرام حاصل کرتے رہتے تھے۔ آپ کے ہاں سماع کی محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ سخاوت آپکی سرشت میں تھی اسلئے کوئی بھی سوالی آپ کے دروازے سے خالی نہیں لوٹتا تھا آپ کے ہاں دین کے ساتھ دولت کے بھی دریا بہتے رہتے تھے لیکن خود انتہائی سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور فقر پر فخر فرماتے۔ آپکے ان نظریات جذبات اور احساسات کو آپ کے کلام بلاغت نظام میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

آپ اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر تھے اور آپ کا زیادہ تر کلام سندھی کافیوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد سات سو کے قریب ہے۔ آپ کا کلام پورے سندھ میں عموماً اور حُر جماعت کے سماع کی محفلوں میں خاص طور پر گایا جاتا ہے۔ آپ کے کلام سے ان کے درویشانہ اور عارفانہ مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کا تخلص اصغرؔ تھا۔

آپ نے اپنے والد بزرگوار حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ کے "ملفوظات" کو بنام "خزانۃ المعرفت" فارسی زبان میں جمع کیا۔ اس کتاب کے ابواب کی ترتیب اور اقوال کے انتخاب سے آپ کے علم و فضل کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تکملہ مقالات الشعراء کے مصنف مخدوم محمد ابراہیم خلیل لکھتے ہیں کہ:-

"ٹھٹھہ کے ایک عظیم عالم مخدوم عبدالکریم بن مخدوم غلام حیدر سے صحبت کے بعد ایک بیرونی سیّاح نے فرمایا کہ :-

میں نے سندھ کے مشائخ کے ساتھ صحبتیں کی ہیں. لیکن میں نے دو بزرگوں جیسا دانا کہیں نہیں دیکھا ایک پیر علی گوہر شاہ اصغر. جو کہ حسین اور گفتگو میں دانا ہیں اور دوسرے مخدوم عبدالکریم"

اس تکملہ میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ :-

"سندھ کے ایک دوسرے عظیم عالم و فاضل آخوند احمد بن آخوند عبدالعلیم سانونی، ہالائی. جو کہ میر عبدالحسین سانگی اور دوسرے میر صاحبان کے استاد اور فارسی کے بڑے شاعر تھے وہ بھی حضرت پیر علی گوہر شاہ اصغر کے مرید تھے"

یہ صاحب دل اور فیاض پیر صاحب ۳۲ برس کی عمر میں بتاریخ ۱۱ رجمادی الاول ۱۲۶۳ھ میں دار فانی سے رحلت کر گئے. ان کے وصال کی تاریخ مندرجہ ذیل قطعے سے نکل سکتی ہے

جناب پیر علی گوھر آں کریم و رشید
چوں رمز "ارجعی" از درگاہ راز شنید
گذاشتہ جسم دریں دانگاہ ناسوتی
بہ سوئے گلشن. لاہوت، مرغ جانشیں پرید
بتافت رخ ز ظھورات آں سراپا نور
بتافت معنئ سیمرغ وش نہاں گردید
دلم چو سال وصالش جست ھاتف گشت
بہ آفتاب بہ پیوست نور مئے توحید

۶۳ — ۱۲ھ

حضرت پیر حزب اللہ شاہ | آپ بذات خود عالم انسان تھے اور علم

دوستی میں بہت معروف تھے۔ بہت دور دور سے لوگ آپ کی قدردانی کی وجہ سے آتے تھے اور فیض پاتے تھے۔ آپ کا تخلص مسکین تھا اور بہت عمدہ شاعر بھی تھے۔ آپ کے فیض یافتہ لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور مولوی بہاءالدین المتخلص بہ "بہائی" ساکن زیدکوٹ نزد میر پور ماتھیلہ ضلع سکھر تھے۔ جو خود بھی بہت عالم شخص تھے۔

حضرت پیر صاحب حزب اللہ شاہ نے آپ کی اسقدر ہمت افزائی اور قدردانی کی کہ اسکی مثال مشکل سے ملیگی۔ حالانکہ بہائی کی ملاقات حضرت پیر صاحب سے ان کے آخری ایام میں ہوئی تھی۔ اس قدردانی کی بنیاد دراصل وہ غزل ہے جو آپ نے حضرت پیر صاحب کے سامنے پڑھی تھی۔ اور جس کے اس شعر پر پیر صاحبنے بالخصوص بہت داد دی تھی ؎

بہ شمشیر محبت سر بریدم ہستی خود را
شہید تیغ عشقم پیرہن بر تن کفن دارم

اس کے بعد بہائی نے ایک اور غزل پیش کی جس سے پیر صاحب وجد میں آگئے۔ اور داد و تحسین سے گذر کر پالکی سمیت اپنا ہاتھی بطور انعام مرحمت فرمایا۔ مولوی صاحب نے ہاتھی لینے سے معذرت چاہی اور عرض کیا کہ اسکو سنبھالنا تو بادشاہوں اور امیروں کا کام ہے۔ یہ سنکر حضرت پیر صاحبنے فرمایا "ہمیں معلوم ہے کہ آپ تونگر نہیں لیکن ہم اپنا خیابان بھی آپ کو بخش دیتے ہیں۔ آپ اس ہاتھی کو نواب بہاولپور کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کریں۔ تاکہ یہ بات آپ کی اولاد کے لئے باعث فخر رہے کہ یہ مولوی بہاؤالدین ہی تھا۔ جنہوں نے نواب بہاولپور کو ہاتھی بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

ہم ذیل میں اس غزل کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جسے سنکر حضرت پیر صاحب نے مولوی صاحب کو ہاتھی بطور تحفہ دیا تھا۔

قربِ حق شد منزلِ ما۔ عشقِ جانِ جانِ ماست
ماشہِ ملکِ دل و عرشِ عظیم ایوانِ ماست

باعثِ ایجاد مائیم از پئے ہر دو جہاں
ہر دو عالم فی الحقیقت منّت احسانِ ماست

ماکہ از روزِ ازل مارا محبت مشرب ست
عشق بازی دینِ ما و عشقِ عشق ایمانِ ماست

عشق یعقوب ست و عقل اخوانِ ما۔ مایوسفیم
ما عزیزِ مصرِ عشقیم و خودی زندانِ ماست

ما بدنیا سخت نادانیم و در دیوانِ عشق!
عقلِ عالم نوسبق شاگردِ شاگردانِ ماست

آفتابِ عالم افروز ست نورِ فیضِ ما
از "متھیلہ" تا "کراچی" جلوۂ جولانِ ماست

عالمِ عقبیٰ کراچی و متھیلہ ایں جہانست
ہر دو عالم روشن از خورشیدِ نور افشانِ ماست

مدحِ ما مشہور "الانسان سرّی" واقع است
برقعِ آں شاہدِ سر صورتِ انسانِ ماست

از ازل مارا چہ دستارِ خلافت بر سرست
شانِ ما ایمانِ ما قرآنِ ما برھانِ ماست

در دو عالم گوی اقبال از ہمہ کس بُردہ ایم!
از زمین تا نہ فلکہا عرصۂ میدانِ ماست

در دو عالم گردی از چیزی نیابی چوں سخن

بادۂ بنگر کہ آں ہم لعل خوش از کانِ ماست

از پئی مٗا خاک گسترده بساطِ انجمن ! !

آسماں در رقص و حالتہا ہم از دستانِ ماست

طالبِ ذاتِ خدائیم و خدا مطلوبِ ماست

دردمندِ ایزدیم و ذاتِ حق درمانِ ماست

ایں ہمہ اقبالہا داریم از اقبالِ عشق

بندگانِ حضرتِ عشقیم و او سلطانِ ماست

ایں نہ فخریہ بگفتم بلکہ حمدیہ بود !

نحن اقرب، رابہیں برہان ما قرآنِ ماست

ای "بہائی" قدر خود را کاش کہ نشناختیم

ورنہ مدح بیحدِ ما نے حدِ امکانِ ماست

* * *

غزل گو شاعر اور قدر دان پیر صاحب دونوں ہی ستائش کے قابل ہیں، پیر صاحب فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر تھے اور "دیوان مسکین" ان کی یادگار کے طور پر اب تک محفوظ ہے۔

سیّد شاہ مردان شاہ اوّل

آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا گیا تھا اور علم دوستی میں آپ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح بہت معروف تھے۔ آپ نے مولوی بہاؤ الدین بہائی (جن کی غزل ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں) کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں ایک دستی چھاپہ خانہ مرحمت فرمایا تھا۔ جسے مولوی صاحب نے "مطبع راشدیہ"

کے نام سے گوٹھ سلطان تعلقہ میرپور ماتھیلو میں قائم کیا تھا۔ اور اس مطبع سے آپ نے بہت سی تصنیفات شائع کی تھیں۔

پیر حزب اللہ شاہ صاحب نے مولوی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ بشرطِ حیات ان کے کلام کو سنہری حروف میں چھپوائیں گے۔ لیکن آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ پروگرام پورا نہ ہوسکا۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین سید علی گوہر شاہ ثانی اور ان کے بعد شاہ مردان شاہ اول نے مولوی صاحب کی بہت قدر دانی کی۔

آپ نے اپنے مدرسہ کے لائق عالم اور مدرس مولانا عبدالرحمان دھامراہ کی بہت ہمت افزائی کی تھی۔ یہ صاحب تقریباً ۲۵ سال تک اس گوٹھ میں درس دیتے رہے تھے اور اس مدرسہ کی آپ نے بڑی خدمت کی تھی۔

آپ نے ایک رسالہ بعنوان "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علم غیب" مخدوم اللہ بخش کھرڑوی سے لکھوایا تھا۔ یہ رسالہ ابھی تک مخدوم مولانا امیر احمد کے پاس موجود ہے۔ یہ حضرت پیر صاحب کے علمی ذوق کا ایک ثبوت ہے۔

جب پیر علی گوہر شاہ اوّل المتخلص بہ اصغر نے نئون گوٹھ آباد کیا جسے بعد میں پیر گوٹھ کے نام سے پکارا گیا تو اس وقت منشی عبدالکریم داؤد پوتہ کے دادا کو جوروہڑی کے رہنے والے تھے اپنے پاس بلا کر ملازم رکھا اور درگاہ کے نزدیک جگہ دیکر انہیں اس گوٹھ کا باشندہ بنایا۔ ان کے بعد منشی عبدالکریم کے والد محمد صالح پیر صاحب کے خلیفہ رہے۔ ان کی ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیں سنایا کریں۔ حضرت شاہ مردان شاہ نے منشی عبدالکریم کو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درگاہ کا میر منشی مقرر کیا جب حضرت شاہ مردان شاہ کا انتقال ہوگیا تو منشی عبدالکریم بھی خیرپور چلے گئے۔

منشی صاحب شاعر تھے اور حضرت پیر صاحب کی صحبت نے انہیں جلا بخشی تھی

وہ اپنے کلام کی اصلاح کے لئے بھی حضرت پیر صاحب کی طرف ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ ان کا کلام زیادہ تر نعتیہ ہوتا تھا۔ کیونکہ درگاہ شریف کا ماحول ہمیشہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے گونجتا رہتا تھا۔

پیر صاحب نے اپنے خرچ سے گوٹھ میوہ رند میں ایک دینی مدرسہ قائم کر دیا جس میں ۱۳۱۶ھ سے ۱۳۲۱ھ تک حاجی جام علیانی نعاری ساکن دیہہ علیانی تعلقہ ڈگری ضلع تھرپارکر بطور مدرس خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ سندھی اور قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد آپ کو پیر صاحب نے ۱۳۲۵ھ میں ضلع تھرپارکر اور حیدرآباد میں اپنی اراضی کا مختار عام مقرر کیا۔

فقیر پیر بخش کلوئی ساکن گوٹھ بچل کادی تعلقہ ٹنڈو باگو ضلع حیدرآباد نے ۱۳۵۵ھ میں حضرت سید علی گوہر شاہ عرف "مخفے دھنی بادشاہ" سے ذکر لیا اور بیڑی سگریٹ وغیرہ چھوڑ کر آہستہ آہستہ سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے یہ پیر صاحب کی خاص توجہ اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ آپ کو مزاحیہ شعر کہنے کا بھی شوق تھا ایک دفعہ آپ نے کسی میگھواڑ کے متعلق کچھ اشعار کہے جب یہ خبر حضرت سید شاہ مردان شاہ کو ملی تو آپ نے انہیں بلا کر یہ اشعار سنے اور فرمایا" افسوس ہے کہ تمہارا وقت اکارت گیا اگر اتنی کوشش اور محنت قرآن مجید کا علم حاصل کرنے میں کرتے تو قرآن کا علم حاصل کر لیتے"

چونکہ یہ الفاظ ایک صاحب دل کی زبان سے نکلے تھے اور بقول ڈاکٹر اقبال ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

فقیر پیر بخش کے دل پر چوٹ لگی اور انہوں نے قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسے مکمل کر لیا۔ اور اب ان کے اشعار کا موضوع مزاح سے

بدل کر نعت اور اپنے مرشد حضرت پیر سائیں کی مدح کی طرف ہو گیا۔

آپ نے اپنے مریدوں کے قصبوں میں دینی مدرسے قائم کروائے جہاں قرآن پاک کی ناظرہ تعلیم دی جاتی تھی۔ آپ نے دینی علم کے فروغ کی خاطر قرآن پاک اور دوسری دینی کتب چھپوا کر مفت تقسیم کروائیں۔ قرآن پاک کی سندھی تفسیر "تفسیر شاہ مردان" ان کتابوں میں سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ علما حفاظ اور مولویوں کی اعانت کرتے رہتے تھے اور بہت سوں کے لئے ماہانہ وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ وار مبارک روہڑی کی خانقاہ کی مرمت بھی آپ ہی نے کروائی اور اس پر سونے کی برجی تعمیر کروائی۔ حضرت مخدوم محمد اسماعیل (پریاں لوء) کے مقبرہ کی مرمت اور حفاظت کا انتظام بھی آپ ہی نے کیا تھا۔ قحط کے دوران آپ بیل گاڑیوں میں گندم اور کپڑا لدھوا کر خلق خدا میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ آپ بہت بڑے سخی تھے۔ درگاہ پر لنگر خانہ ہمیشہ چالو رہتا تھا اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ آپ اپنی سخاوت، علم دوستی اور رحمدلی کے باعث پورے سندھ میں مشہور ہوئے۔ آپ کا انتقال ۷۱ برس کی عمر میں ۷ ربیع الاوّل سنہ ۱۳۴۰ھ کو ہوا۔

حضرت پیر سائیں صبغت اللہ شاہ ثانی شہیدؒ

آپ اگرچہ زیادہ تر عسکری نظام اور جنگ آزادی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مگر علم و ادب اور دینی خدمت میں آپ نے بہت کچھ کیا ہے۔ چنانچہ جب آپ رتناگری جیل میں تھے تو آپ نے سلوک و معرفت کے مختلف مدارج کے متعلق ایک بیاض مرتب کی جس کے پہلے صفحے پر انگریزی میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے

CERTIFIED THAT THIS BOOK CONTAINS 100 PA-JES
9 ELLIS
SUPERINTENDENT- 12 PRION 16-4-31

اس کے بعد پیر صاحب کے ہاتھوں کے یہ لوٹ تھے" یہ کتاب ہمیں رتناگری کی جیل میں ملی ، تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۳۱ء"

اس بیاض میں سے منتخب کئے ہوئے مواد کا بغور مطالعہ کرنے سے خود حضرت پیر صاحب کے ذوق مطالعہ اور بلند اخلاق پر روشنی پڑتی ہے ۔ سندھی نثر میں پیر صاحب کی عبارت موثر اور دل پزیر ہے ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "ہم اس کتاب میں نصیحت کی باتیں لکھیں گے جو خلقِ خدا کو برُے کاموں سے بیزار کر دیں ۔"

پہلی حکایت میں کہتے ہیں" مرید جو سچے ارادے سے مرشد پکڑتے ہیں اور اپنے مرشد کا کہنا نہیں مانتے ۔ حقیقی فیض سے محروم رہیں گے کیونکہ مرید کے لئے یہ واجب ہے کہ وہ مرشد کی ہر بات پر عمل کرے ۔"

شعر :- " ہر نقطہ او شگفتہ باغی افروختہ تر زشب چراغی
نفظش چو طراوت جوانی ، معناش چو آب زندگانی "

ہم تبرک کے طور پر آپکی چند سندھی کافیاں بھی پیش کرتے ہیں :-

موکي هيٺ کوجادو سهڻا يار دل لئي ويئن
کري چشمن سند وکو چالو سر ساه پڻي سڻي ويئن

۱- کري پهريون مٺيون تو ڳالهيون . وڏيءَ يار دل کي دواليون
هيٺ نيڻن سنديون دوناليون ، منهنجا دوست دل ڦٽي ويئن

۲- تنهنجو عشق آهي ڦهڙي ، مثل ، پير ! باز بحري
ويٺي بلبل کي وقت سحري ، نيڻ منهجي دل جهٽي ويئن

۳- صبغت الله جي سڻ تون زاري ، کرکاتون ستاري ،
هيکر ڏيئي ڏيکاري ، تهان پوءِ منهن مٺي ويئن

جڳائي مدامي ذکر سان زبان ، نه کوڙي دنيا جو کجي کوبيان

سچائيءَ سند ويا ڪٺ تون قدم - ڇيو آ عجب دوست منهنجي قلم
پنڻ تي پهريو آهي پيران زور - پنڻ ڪما نهيءَ جو جوگا نڻ ولغور
پنن پيرتا پيا هميشه مسلم - وڃي ڪن تا ماڻهن جو گهر منجهه سلام

★ ★ ★

نه پيرن ڪئي خلق جي رهبري - پڳ ۾ بدن تا ڪوڙن جي پيري
رکج يار تون پا نهجي صاف دل - ڪري خيال ڏس جو تون آهين امل
دل کي رکج تون هميشه صفا - ڪوڙي دنيا جا چڏي سڀ خفا
زبان دل جنهن جي تئي هڪ يار
تنهين تان سوين سر آهن نثار

روحانی اور عسکری خدمات

اس خاندان نے رشد و ہدایت کے مینار کی سی حیثیت اختیار کی ہے اور بالخصوص حضرت سید محمد لقمانؒ سے لیکر آج تک تقریبًا دو صوبوں سے اسکی پھیلائی ہوئی روشنی سے ہزاروں بھولے بھٹکے انسان راہ ہدایت تک پہنچ گئے نقشبندی اور قادری سلسلے کے بڑے بڑے صوفیائے کرام بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی خاندان کے فیض یافتہ ہیں۔ آزادی وطن کی تحریکوں میں جن بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا ہے وہ سب کے سب اسی شمع سے منور ہوئے تھے۔ مولانا تاج محمود امروٹیؒ ۔ مولانا حماد اللہ ۔ مولانا احمد علی لاہوری ۔ اور بھرچونڈی والے بزرگ کسی نہ کسی واسطہ سے اسی خاندان سے نسبت رکھتے ہیں۔ اور یہ سب جلیل القدر ہستیاں روحانی، علمی اور سیاسی میدانوں میں منفرد مقام کی حامل ہیں۔ سرزمین سندھ کو ان بزرگوں پر ہمیشہ ناز رہیگا اس خاندان کی باطنی تربیت کا سلسلہ سندھ سے بہت دور راجستھان - بلوچستان ۔ کچھ کاٹھیاواڑ اور بہاول پور

جیسے علاقوں تک محیط تھا۔ ذکر و فکر۔ اوراد و اشغال اور اصلاح و تربیت کا یہ سلسلہ جوئے مسلسل کی طرح پیہم رواں دواں رہا ہے۔ اور ہزاروں بندگانِ خدا اس سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔

حضرت سید احمد شہید سے پہلے حضرت سید صبغت اللہ شاہ اوّل نے حریت پسندی کی جو شمع روشن کی تھی اس کے پروانے حُر کہلائے جو تقریباً پونے دو سو سال تک جبر و استبداد کے خلاف نبرد آزما رہے اور اس خاندان کے پیرانِ عظّام اس کی رہنمائی کرتے رہے انہوں نے سیرت و کردار کے ساتھ ساتھ سپاہیانہ جذبات کی نشو و نما اس انداز سے کی کہ انگریز جیسی حکومت اپنے بے پناہ وسائل کے باوجود اس تنظیم اور جذبہ کو کچلنے میں بالکل ناکام رہی۔ ایسی سپاہیانہ تحریکیں عام طور پر ایک صدی کے اندر ہی اپنی موت آپ مرجاتی ہیں۔ مگر یہ تحریک جانکنی کے عالم سے گذر کر بھی زندہ رہی اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں "پیجھ۔ پاگارو" کے نعروں نے اسکی زندگی تابندگی اور رخشندگی کا ناقابل فراموش ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اگرچہ روحانی اور اخلاقی تربیت صوفیائے کرام کے دوسرے سلسلے اور کئی دوسری خانقاہیں بھی کرتی رہی ہیں۔ مگر سپاہیانہ تربیت صرف اسی خاندان کا طرّہ امتیاز ہے۔ حُروں کے روپ میں اگرچہ کئی ڈاکو اور لیٹرے بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اس سے یہ تحریک بدنام نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دشمن کے خلاف اور بالخصوص انگریز اور بھارت کے خلاف نبرد آزما ہونا صرف مجاہدوں کا کام ہے۔ یہاں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گذر ممکن نہیں ہے۔ تاہم اگر کسی باقاعدہ مرید یا حُر نے کوئی غلطی کی ہے تو یہ اس کا انفرادی فعل ہے۔ اس سے پوری تحریک پر کیچڑ نہیں اُچھالا جاسکتا کیونکہ اس سلسلے میں تحریک کے بانیوں کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ بلکہ اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ اگر کوئی رحیم ہنگورو جیسا خود سر دوسروں کے لئے بھی اذیّت کا

باعث ہوا تھا تو پیر پاگارو کے حکم کے سامنے اس نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ایسی عسکری تنظیم اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ جب تک ان کے رہنما خود سپاہیانہ جوش اور جذبہ سے سرشار نہ ہوں اور تاریخ کے اوراق ثابت کرتے ہیں کہ سادات کا یہ ممتاز خاندان انہی روایات اور کردار و سیرت کا پوری طرح حامل ہے۔ اور بے شک یہ کام ایسے ہی مردانِ خدا کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے ہر صدی ہر ملک اور ہر موقع پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ ہم ان شہیدوں کو سلام کہتے ہیں۔

موجودہ پیر سائیں پاگارہ کی ایک اور تصویر مبارک سندھی دستار کے ساتھ

باب ہشتم

قیام پاکستان
اور
اس کے بعد

(موجودہ پیر پاگارہ حضرت سید شاہ مردان شاہ ثانی کا دور)

آغازِ سُخن

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا جو خواب حضرت سید احمد شہید اور حضرت سید صبغت اللہ شاہ اوّل نے دیکھا تھا۔ اور آزادیِ وطن کی جس جدوجہد میں حضرت سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ بالآخر ملتِ اسلامیہ کی مشترکہ مساعی سے وہ خطۂ ارض پاک خداوند تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت کے ان ناتوانوں کو مرحمت فرمایا جو پشاور سے کراچی اور ڈھاکہ سے چاٹگام تک اسکے منتظر تھے۔ اگرچہ ماضی قریب میں اسکا مشرقی حصہ سازشوں کا شکار ہو کر ٹوٹ گیا۔

یہ دنیا کا حسین ترین، زرخیز ترین اور اعلیٰ ترین خطۂ ارض ہے اسکی ندیاں کوثر و تسنیم کو شرماتی ہیں۔ اس کے میدان رشکِ گلشنِ فردوس ہیں۔ اسکی ہوائیں عطر بیز۔ اور فرحت زا ہیں۔ اسکی زمین سونا اگلتی اور پہاڑ چاندی پیش کرتے ہیں ریلیں پیچ و خم کھاتی ہوئی میلوں کی مسافت منٹوں میں طے کرتی ہیں۔ کارخانوں کی چمنیاں دھوئیں کی اوٹ میں سیم و زر کے ڈھیر لگاتی ہیں۔ شہروں میں رونق دیہاتوں میں آبادی اور جنگلوں میں دولت ہے۔ اسکی کوکھ سے جنم لینے والے سپوت دُنیا کے مانے ہوئے جنگجو ہیں۔ اسکی گود میں پرورش پانے والے ہر شعبۂ حیات میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ چوڑے سینے، بھرے ہوئے بازو، سرخ گلے اور رنگا رنگ کے ملبوسات

ہیں حسن د رعنائی کے یہ پیکر دنیا کے ہر گوشے میں رشک کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر ہاں ضرورت سے زیادہ سادہ لوح ہیں۔ جس نے لمبے چوڑے دعوے کئے۔ فلک شگاف نعرے لگائے اور خوش آئند کہانیاں سُنائیں بس اسپر "زندہ باد" کے نعرے لگا کر پروانہ وار نثار ہو گئے اور بقول غالب ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

۲۵ سال گذرنے کے باوجود ابھی تک اپنے راہبروں کو نہیں پہچان سکے۔ حالانکہ ۲۵ سال کا جوان اپنے نفع و نقصان کو خوب سمجھتا ہے۔

اس ارض پاک کا عطیہ مشروط تھا اور وہ شرط حکومت الٰہیہ کا قیام یعنی اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ ہم ۲۵ سال تک خالق اکبر کو دھوکا دیتے رہے اور آخر دھوکے بازی کی سزا اِس صورت میں ملی کہ آدھا ملک ہندو کی غلامی میں چلا گیا اور جو آدھا باقی رہ گیا ہے اسکی سلامتی اور سالمیت کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ افسوس آزادی کی قدر و قیمت جاننے اور اسکی حفاظت کرنے کی بجائے ہم خود کو خوشی خوشی اغیار کی غلامی میں دینے کے لئے بے قرار ہیں۔ اور سازشوں کے جال پھیلائے جا رہے ہیں تاکہ جو اس کے قائل نہیں ہیں انہیں مکر و فریب سے اس میں پھانس لیا جائے۔

اس خطرے سے بچنے کا ایک اور صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے اسلامی نظام حکومت کا قیام اور اخوّت کا پیغام۔ اگر اس سے اب بھی چشم پوشی کی گئی تو غلامی کا پھندا ہوگا اور قوم کا گلا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وطن عزیز کی حفاظت فرمائے۔

حضرت پیر سکندر شاہ الملقب بہ پیر شاہ مردان شاہ ثانی مدظلہ،

ہم اس عنوان کا آغاز نمائندہ "جسارت" کراچی جناب ظہور احمد کے اس انٹرویو

کے ایک اقتباس سے کرتے ہیں جو آپ نے مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو حضرت پیر صاحب سے ان کی قیام گاہ یعنی کنگری ہاؤس کے۔ڈی۔اے اسکیم نمبر ا میں لیا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:-

" حروں کے روحانی پیشوا اور سندھ کے ممتاز و محترم سیاسی رہنما پیر سکندر شاہ صاحب پیر پاگارو ایک ایسے خاندان کی مسند رشد و ہدایت کے وارث و جانشین ہیں جسکی تاریخ علم و حکمت۔ شجاعت و عزیمت اور اسلام دشمن قوتوں سے مسلسل نبرد آزمائی کی روشن داستانوں سے جگمگا رہی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین سے لیکر انگریزوں کے دور استبداد تک اس خاندان نے اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی آزادی کے تحفظ کے لئے جو عظیم قربانیاں دی ہیں۔ ان کی مثال برّصغیر کے کسی دوسرے خاندان میں اسی تسلسل سے بمشکل ہی ملیگی۔ پیر پاگارو انگریزوں کے دور میں جلاوطن ہوئے اور جب تک انگریز برّصغیر پر قابض رہا اس نے ان کے وطن میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ یہ وہ دَور تھا جب برّصغیر میں بہت سے لوگ انگریزوں کی خدمت گذاری کے صلے میں بڑی بڑی جاگیروں۔ عہدوں اور سر یا خانبہادر کے خطابات سے نوازے جا رہے تھے۔

حصولِ آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے پیر پاگارو کی گدی بحال کی اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ واپس وطن لایا گیا۔ پیر پاگارو نے اپنی شاندار خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی تمام تر توانائیاں مملکت خداداد پاکستان کی حفاظت و ترقی کے لئے وقف کر دیں۔ انہوں نے پاکستان کے دفاع کو اپنا نصب العین بنایا۔ اور ہماری ۲۵ سالہ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سندھ

کے محاذ پر بھارت سے اب تک چھوٹی بڑی جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان سب میں حُر مجاہدین ہماری فوج کے شانہ بشانہ دادِ شجاعت لیتے اور ملک کی مقدس سرزمین پر جانیں نچھاور کرتے رہے ہیں حُروں کی یہ عظیم قربانیاں ان کے روحانی پیشوا پیر صاحب پاگارو کی ہدایت و رہنمائی ہی کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں حُروں نے جس طرح سندھ محاذ کو سنبھالا ہے۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ آج بھی سندھ کی سرحدوں پر ہزاروں حُر مادرِ وطن کی سرحدوں پر دشمن کے لئے ایک ناقابلِ تسخیر چٹان بنے کھڑے ہیں۔

پیر صاحب پاگارو اپنی انہی خدمات کے باعث پاکستان بھر میں اور بالخصوص سندھ کے اندر انتہائی قدر و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ موجودہ حکومت نے گذشتہ دنوں جب اس محبِّ وطن اور اسلام دوست شخصیت کو اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے تراشیدہ "لندن پلان" میں ملوث کیا اور ڈپٹی کمشنر خیرپور کے ذریعے بھیجے جانے والے اظہارِ وجوہ کے نوٹس میں ان پر ملک دشمنی اور غداری جیسے سنگین الزامات لگائے تو ہر پاکستانی تڑپ اٹھا اور حکومت کے اس اقدام پر چاروں طرف سے مذمت اور ملامت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پیر صاحب نے اس موقع پر غیر معمولی صبر و تحمّل کا ثبوت دیا اور ایک پابند قانون شہری کی حیثیت سے حکومت کو لکھ بھیجا کہ آپ سے عدالت میں ملاقات ہوگی"۔

ہم اسی اخبار میں دیئے گئے آپ کے سوانحی خاکہ کی نقل بھی پیش کرتے ہیں۔

" پیر سکندر شاہ جو شاہ مردان شاہ ثانی کے لقب سے پیر پاگارو مشہور ہیں ۔ پیر سید صبغت اللہ شاہ کے صاحبزادے ہیں جنہیں انگریزوں نے آزادی کی جدوجہد کے جرم میں ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو حیدرآباد میں پھانسی دے دی تھی ۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ سید علی لکیاری تھے جو عباسی دورِ حکومت میں سندھ آئے انکی بیسویں پشت میں سید محمد بقا نام کے ایک بزرگ پیدا ہوئے جن کے ایک فرزند سید محمد راشد تھے مغلوں کے آخری دور میں جب سید احمد شہید بریلوی نے اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے لئے جہاد شروع کیا تو اس وقت سید محمد راشد کے صاحبزادے سید صبغت اللہ شاہ اول اسی خاندان کے سربراہ تھے ۔ آپ نے اس جہاد میں سید احمد شہید سے بھرپور تعاون کیا ۔ انگریزوں کے ابتدائی تسلط کے دور میں حُروں نے ان کے خلاف مزاحمت شروع کی اس تحریک کو کچلنے کے لئے انگریزوں نے ظلم و جبر کا ہر حربہ استعمال کیا ۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں موجودہ پیر صاحب کے والد پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی سجادہ نشین بنے ۔ تحریک آزادی شباب پر تھی ۔ حُروں نے ایکبار پھر برطانوی تسلط کے خلاف زبردست تحریک شروع کر دی ۔ پیر صبغت اللہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ۹ برس تک قید و بند کے مراحل سے گذرنے کے بعد پھانسی دیکر شہید کر دیا گیا ۔ موجودہ پیر پاگارو اور آپ کے بھائی پیر نادر شاہ کو انگلستان بھیجکر سجادہ نشینی ممنوع قرار دے دی گئی ۔ اس وقت دونوں بھائیوں کی عمریں دس اور بارہ سال تھیں دونوں بھائیوں نے انگلستان میں گریجوئیشن کیا ۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں شہید ملت لیاقت علی خاں کے دور حکومت میں سجادہ نشینی بحال ہو گئی تو آپ

پاکستان میں آ گئے اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ۔ پیر صاحب شروع سے ہی نظریۂ پاکستان کے حامی اور اسلامی نظام کے خواہاں رہے ہیں ۔ ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو انہوں نے اپنے مریدوں کو وطن کے دفاع کے لئے پکارا ۔ اور آپ کے ہزاروں مریدوں نے وطن کے دفاع کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کی سالمیت کو بھارتی چیلنج کا سامنا ہوا تو ایک بار پھر آپ ۔ اس چیلنج سے نمٹنے کے لئے اپنے مریدوں کو ساتھ لیکر نکل کھڑے ہوئے اور یوں ہر دور میں پیر پاگارو اور ان کے مرید پاکستان سے اپنی غیر مشروط وفاداری اور محبت کا ثبوت فراہم کرتے رہے ہیں "

آپ کے ابتدائی حالات

آپ پیر جو گوٹھ ضلع خیر پور میرس میں ۲۲ نومبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے آپ حضرت سید صبغت اللہ شاہ شہیدؒ کے سب سے بڑے فرزند ہیں ۔ آپ کا اصلی نام پیر سکندر شاہ ہے ۔ آپ کے چھوٹے بھائی نادر شاہ صاحب آپ سے تقریباً دو سال چھوٹے ہیں آپ کی عمر اس وقت تقریباً چودہ سال تھی جب آپ کے والد محترم کو ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو پھانسی دے دی گئی تھی ۔ آپ کے اہل خاندان کو کراچی میں نظر بند کر دیا گیا تھا چنانچہ آپ نے ہفت روزہ "لیل ونہار" مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء کو کوئٹہ میں انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا :-

" ہم دونوں ان دنوں چھوٹے بچے تھے ۔ تاہم ہمیں کچھ نہ کچھ سوجھ بوجھ حاصل تھی ۔ اسی بنا پر ہمارا اندازہ تھا ۔ کہ کوئی نہایت اہم بات ہو رہی ہے ۔ آج سے تینتیس سال پیشتر بچے آج کی طرح بڑوں کی مجلس میں نہ بیٹھتے تھے اور نہ گفتگو میں شریک ہوتے تھے ۔ اس لئے براہ راست

موجودہ پیر سائیں پاگارہ کے چھوٹے بھائی حضرت پیر نادر شاہ صاحب

تو کچھ علم نہیں البتہ اس وقت کے مشاہدات کو یاد کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک بالکل ابتدائی درجے میں تھی۔ کچھ لوگ مسلح جدوجہد کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت تک نہ تحریک کا کوئی ہیڈ کوارٹر طے ہوا تھا۔ اور نہ طریقۂ کار کا فیصلہ ہوا تھا۔ کوئی کمانڈ بھی نہیں بنائی گئی تھی اور نہ جدوجہد کے لئے مقام اور وقت کا تعین ہوا تھا اور شاید ابھی تک کوئی باقاعدہ تنظیم ہی نہیں بنی تھی۔ بہر حال ہمیں اپنے بھائی والدہ اور گھر کے دوسرے افراد سمیت حراست میں لے لیا گیا۔ پیر گوٹھ سے کراچی لایا گیا۔ ہمیں اس وقت بندر روڈ کے ایک بنگلے میں زبردست پہرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے ساتھ ہمارے چار پانچ ملازم تھے۔ انہیں بھی باہر جانے یا کسی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یعنی وہ بھی ہمارے ساتھ ہماری ہی طرح قید تھے یہ بنگلہ ماما پارسی اسکول کے پاس ہے۔ اس وقت یہ ٹنڈو باگو کے میر خدا بخش تالپور کی ملکیت ہے۔ آج کل اس بنگلہ میں ڈاکٹر مس صدیقی کا کلینک ہے۔ ہمارے پاس دو مرد ملازم تھے ہم نے ان میں سے ایک کو جانے پر مجبور کیا۔ اور اسے بمشکل راضی کیا۔ حقیقتاً ہمارے لئے یہ نہایت مشکل کا دور تھا۔ نظر بندی کے سوا اور بہت سی تکالیف تھیں۔ ہمیں کسی قسم کی طبی امداد بھی نہ دی جاتی تھی۔ ہم اپنے بے قصور ملازمین کو اس مصیبت میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمارے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ انہی دنوں ہمارے والد پیر صاحب شہیدؒ پر حیدرآباد میں بند کمرے میں خصوصی مارشل لاء عدالت میں مقدمہ چلا اور انگریز نے انہیں شہید کرنے کا فیصلہ کیا۔“

حضرت شہیدؒ کی شہادت کے بعد

حضرت پیر صاحب نے اسی انٹرویو میں فرمایا :-

" ہم ذہنی طور پر بہت پہلے سے اس کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ انگریز آزادی کے مجاہد کو اس سے کم کیا سزا دے گا۔ ان تمامتر پابندیوں کے باوجود ہمیں کئی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ ہمارے پہرے پر مقرر سپاہیوں میں سے کئی ایک کو ہم سے اور اس مقصد سے جس کے لئے ہمارا خاندان قربانیاں پیش کر رہا تھا، ہمدردی تھی۔ وہ ہمیں حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ شہادت سے کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۴۳ء کے آخر یا ۱۹۴۴ء کے اوائل میں ہمیں تعلیم کے لئے علی گڑھ لے جایا گیا۔ اسکی صورت یہ تھی کہ ہمیں اور ہمارے چھوٹے بھائی نادر شاہ کو شام کے جھٹپٹے میں برقع اڑھا کر ریلوے اسٹیشن لایا گیا اور گاڑی میں تمام راستے کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور ہم پر پولیس کا بھاری پہرہ تھا دہلی کے قریب جا کر کھڑکیاں کھولی گئیں اور ہم نے برسوں کے بعد کھلی فضا کو دیکھا۔ یہ تمام کارروائی پولیس کے ایک آفیسر محمود حسین کی نگرانی میں ہوئی اور وہ تمام وقت ہمارے ساتھ رہے یہ وہی محمود حسین ہیں جو بعد میں اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی ریٹائر ہوئے

نظر بندی کے دوران ہماری درخواست پر برطانوی حکومت نے پراسیکوٹنگ انسپکٹر صدرالدین کو قرآن پاک پڑھانے پر مامور کیا جو کبھی کبھار آ کر ہمیں قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ میں ہمارے لئے کوئی خصوصی انتظام نہ تھا۔ جون ۱۹۴۶ء میں سمندری جہاز کے ذریعے مجھے اور نادر شاہ کو لورپول (انگلینڈ) پہنچا دیا گیا۔"

انگلینڈ میں آپ کی نظر بندی

آپ دونوں بھائیوں کو ہیرو کے قریب پنر (PINNER) میں میجر سی ڈیوس کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ چونکہ یہ گاؤں شاہراہ سے کافی ہٹ کر تھا اسلئے کوئی سیاح یا دوسرا بڑا شخص نہ آتا تھا۔ کیونکہ وہاں ان کے لئے دلچسپی کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہاں آپ کو انگریزوں نے اپنے مقاصد کی خاطر رکھا تھا۔ پیر صاحب فرماتے ہیں:۔

"میجر ڈیوس کے اسکول میں طالب علموں کی تعداد کبھی بارہ تیرہ سے زیادہ نہ رہی۔ اور اس میں سب غیر ملکی تھے۔ ہمارے وہاں قیام کے دوران رہوڈیشیا۔ تھائی لینڈ۔ عراق۔ ایران۔ آئس لینڈ اور حبشہ کے طلبہ مقیم تھے۔ یہ تمام طالب علم ان ممالک کے نمایاں لیکن غالباً باغی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں ایسی فضا تھی۔ کہ کوئی بھی اپنے خاندان یا ملک کے بارے میں بات نہ کرتا تھا۔ ان میں حبشہ کے ایک مسٹر زوڈی بھی تھے۔ جو ہمارے کچھ قریب آئے۔ زوڈی شہنشاہ حبشہ ہیل سلاسی کے رشتہ دار تھے۔ مضامین کا انتخاب بھی ہماری مرضی پر نہ تھا۔ ہمیں جس امتحانی کورس کی تیاری کرائی جارہی تھی۔ اس میں عیسائیت کا ایک مضمون DIVINITY بھی تھا۔ میں اس کے ساتھ لاطینی پڑھتا تھا۔ چھوٹے بھائی نادر شاہ کو فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی"

قیام پاکستان کے بعد

حضرت پیر صاحب فرماتے ہیں:۔

"قیام پاکستان کے بعد (ہماری پڑھائی کا سلسلہ) کچھ عرصہ اسی طرح چلتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ پاکستان

گورنمنٹ کے نوٹس میں آیا۔ حکومت پاکستان کو اس جانب متوجہ کرنے والے ڈاکٹر رحمان تھے جو سی۔ پی کے مہاجر تھے۔ پاکستان ہائی کمشنر نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ اور ہمیں عیسائیت والے کورس کے بجائے دوسرا کورس دیا گیا۔ انگریزی حکومت نے تمام تر فوجی آپریشن کے باوجود جب عوام میں ہمارے خاندان سے عقیدت میں کوئی کمی نہ دیکھی تو اپنے ہاتھوں میں کھیلنے والا پیر بنانے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح حروں کو اپنے قبضے میں لے لینگے۔

انہوں نے پیر علی محمد راشدی سے یہ کام لینا چاہا۔ جو چوتھی پشت میں ہمارے خاندان سے آملتے ہیں۔ انگریزوں نے پیر صاحب شہیدؒ کے خلاف مقدمے کے لئے انہیں تربیت پر لگادیا تھا۔ پیر علی محمد راشدی گواہوں کے بیانات پہلے خود سنتے پھر انہیں فائنل پرفارمنس کے لئے عدالت میں بھیجتے۔ ہمارے والد صاحب کے وکیل نے ہمیں ان تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ کہ کیسے پیر علی محمد راشدی نے انگریزوں کے منشاء کے مطابق گواہیاں بھگتائیں۔ انگریز اس خدمت کا صلہ انہیں پیر پاگارو کی گدی بخش کر دینا چاہتا تھا۔ اور علی محمد راشدی کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن انہیں اور ان کے آقاؤں کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ایسا کیا گیا تو انہیں پھر ایک نئے طوفان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح انہیں اس کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ مقدمہ پہلے بند کمرے میں اور پھر مارشل لا کی خاص عدالت کے تحت ہوا۔ اس پر مزید پابندی یہ عاید کردی گئی کہ مارشل لا ٹریبونل کے فیصلے اور گواہیوں کے متعلق کسی چیز

کو پبلک میں (DISC USS) زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ محمود حسین اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی۔ قیام پاکستان کے بعد میرے وطن آنے پر مجھے ملے تھے۔ انہوں نے اس زمانے کے واقعات کو ڈائریوں کی صورت میں نوٹ کر رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے نوٹس (NOTBS) بھی دکھائے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ (HUR UPRISTNG) کے عنوان سے کتاب لکھنا چاہتے تھے مجھے معلوم نہیں اس کے بعد ان کے اس عزم کا کیا ہوا۔

وطن واپسی کے بعد

آپ نے فرمایا:۔

ہم انگلستان میں زیر تعلیم تھے کہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان لندن کے دورے پر آئے۔ انہوں نے مجھے اور چھوٹے بھائی نادر شاہ کو اپنی قیام گاہ کلیرجز ہوٹل میں بلایا اور تحریک آزادی میں ہماری خاندانی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت پاکستان ہماری گدی کو بحال رکھنا اپنا قومی فرض خیال کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی زبان سے یہ فیصلہ سنایا تھا۔ اور یہ بات ہمارے لئے قابل تحیر ہے کہ گدی کے احیاء کا فیصلہ تو ۱۹۴۹ء میں کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس پر عمل درآمد ۱۹۵۲ء میں ہوا''

واضح رہے کہ گدی کی بحالی اور حضرت پیر سائیں کی واپسی کے سلسلہ میں درگاہ چھنہاں شریف ضلع گجرات والے بزرگ سید حاجی محمد افضل شاہ گیلانی اور لاڑکانہ والے نقشبندی بزرگ حضرت خواجہ محمد عبدالغفار نے بہت زیادہ سرگرمی سے کام کیا اور ان کی سرکردگی میں مختلف وفود اس وقت کے پاکستان کے وزیر اعظم

شہید ملت خان لیاقت علی خاں اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین سے کئی بار ملے تھے۔ نیز صوبہ سندھ کے سابق گورنر شیخ دین محمد نے درگاہ پر عائد کی پابندیاں ختم کر کے زیارت کو آسان کر دیا تھا۔

مجموعی کوششوں کے نتیجہ میں حضرت پیر سائیں کی دستار بندی ۴؍ فروری ۱۹۵۲ء کو ہوئی اور آپ پاگارہ نمبر سات تسلیم کئے گئے آپ کا روحانی تعلق بھی درگاہ چھنال شریف ضلع گجرات والے بزرگوں سے ہے۔ آپ نے دستار بندی کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ روپوش حُروں کو حاضر ہونے کا حکم دیا تاکہ بدامنی کا سدّباب کیا جائے رحیم ہنگورو نے اس سے پہلو تہی کی اس لئے پکڑا گیا اور پھانسی کی سزا پائی۔

قیام پاکستان کے بعد ان کی گدی بحال کی گئی تھی۔ ضبط شدہ جائداد واپس کی گئی۔ آپ کے بہت سے اثاثے ضائع ہو گئے جن میں بہت سی نادر کتب بھی شامل تھیں۔ آپ نے وطن واپس آکر دینی علم کی تکمیل کی اور علوم شرعیہ اور عربی میں درک حاصل کیا کیونکہ انگریز نے انہیں بے دینی کی تعلیم دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک و ہند جنگیں

ان دونوں جنگوں میں حُر مجاہدین نے جو خدمات سرانجام دی ہیں، ان کا اعتراف غیر ملکی نامہ نگاروں اور خود ہندوستانی فوجیوں نے بھی کیا ہے۔ ہم کچھ تصویریں پیش کر رہے جن سے ان مجاہدین کی عسکری جانبازیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۷؍ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاک بھارت جنگ کے دوران حضرت پیر پاگارو نے کراچی کے اخبارات کے ذریعے حُر مجاہدوں سے اپیل کی تھی کہ وہ وطن کے تحفظ کے لئے مجاہد فورس میں بھرتی ہوں اور دوسرے ہی دن یعنی ۸؍ ستمبر کو آپ عمر کوٹ

موجودہ پیر سائیں پاگارہ شاہ مردان شاہ ثانی سجادگی سے پہلے اور سجادگی کے بعد

میں تشریف لے گئے جہاں تمام حُر جانبازوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا تھا چنانچہ عمر کوٹ کا تاریخی شہر بھیج پاگارو کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اور آپ نے مندرجہ ذیل تاریخی خطبہ دیا۔

"میرے پیارے حُر مجاہدو۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں جہاد کا موقع عطا فرمایا ہے۔ ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے آج بھی کفار اپنے لشکر اور اسلحہ کے غرور میں ہم پر حملہ آور ہوا ہے تاکہ ہم کو برباد اور ہمارے وطن کو تباہ کر سکے۔ اس لئے تم آگے بڑھو اور ملک۔ اسلام اور قوم کی عزت و ناموس اور بقا کے لئے مردانہ وار مقابلہ کرو۔ دیکھنا تمہارے قدم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔ دشمن پر بھرپور حملہ کرو اور فتح حاصل ہونے تک لڑتے رہو۔ بوڑھوں عورتوں مظلوموں اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اللہ تمہارا محافظ ہے۔ آمین"

اس خطبہ نے مجاہدوں میں نئی روح پھونک دی وہ اپنے روحانی پیشوا کی زیارت اور ان کے فرمان سے بے حد مسرور تھے اور بار بار بھیج پاگارہ کے نعرے لگا رہے تھے یہ مجاہد جنگ میں شامل ہو گئے۔ ان کے سالار اعلیٰ خود حضرت پیر صاحب تھے جن کا ہیڈ کوارٹر عمر کوٹ میں تھا۔

حضرت پیر پاگارو خود محاذ جنگ میں کیمپ لگا کر موجود رہے تاکہ مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتے رہیں۔ بحیثیت مجموعی کوئی دوسری جماعت جاں نثاریوں کی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جنگی خدمات حضرت پیر سائیں پاگارہ کے حکم پر تقریباً بیس۲۰ ہزار حُر مجاہدین فوری طور پر میدانِ عمل میں آ گئے۔ ان میں سے

چند ہزار حروں کو باقاعدہ جنگ کے لئے چُنا گیا۔ باقی مجاہدوں کو رسد پہنچانے اور دوسرے امدادی کام سرانجام دینے پر مامور کیا گیا۔ جنگ میں شامل مجاہدوں کو حضرت پیر صاحب کی طرف سے ہدایات تھیں کہ وہ فوج کا پوری طرح ساتھ دیں اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہیں۔ اسلئے مجاہد پورے نظم و ضبط کے ساتھ پاکستانی فوج کی کمان کے احکامات پر عمل کرتے رہے۔ جنگ کے دوران مجاہدوں کی جنگی حکمت عملی کو دیکھکر خود تجربہ کار فوجی جرنیل بھی انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے اس لئے حُر مجاہدوں کو ان کے اپنے کمانڈروں کی کمان میں دے دیا گیا اور ان کو اجازت دی گئی کہ وہ جیسے چاہیں جنگی حکمت عملی اختیار کریں۔

اس جنگ میں مجاہدوں کے پورے۔ فورس کا اعلیٰ کمانڈر فقیر محمد امین منگریو تھا جس کی نگرانی میں رن کچھ سے لیکر رحیم یارخاں تک تمام مجاہدین جنگی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں تقریباً بیس ۲۰ ہزار حروں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا۔

اپنی خصوصی حکمت عملی کے پیش نظر حر مجاہدوں کو دو سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک شمالی سندھ اور بہاولپور۔ دوسرا جنوبی سندھ۔ یہ دونوں سیکٹر متعدد سب سیکٹروں میں تقسیم کئے گئے اور تمام سیکٹروں کی چارج علحدہ علحدہ جنگی مہارت رکھنے والے حُر مجاہدوں کے حوالے کی گئی۔ ان تمام سب سیکٹروں اور دونوں سیکٹروں کا باہمی رابطہ اس طرح سے قائم رکھا گیا کہ جنگ کی تمام اطلاعات فوری طور پر حروں کے مرکزی دفتر میں مجاہدوں کے اعلیٰ کمانڈر فقیر محمد امین منگریو کو پہنچتی رہتیں اور فقیر صاحب مجاہدوں کو ہدایات بھی جاری کرتا رہتا تھا اور ان کی ضروریات کو بھی پورا کرتا رہتا تھا۔

حُر مجاہدوں کے میدان جنگ میں اُتر آنے پر راجستھان کا پورا علاقہ

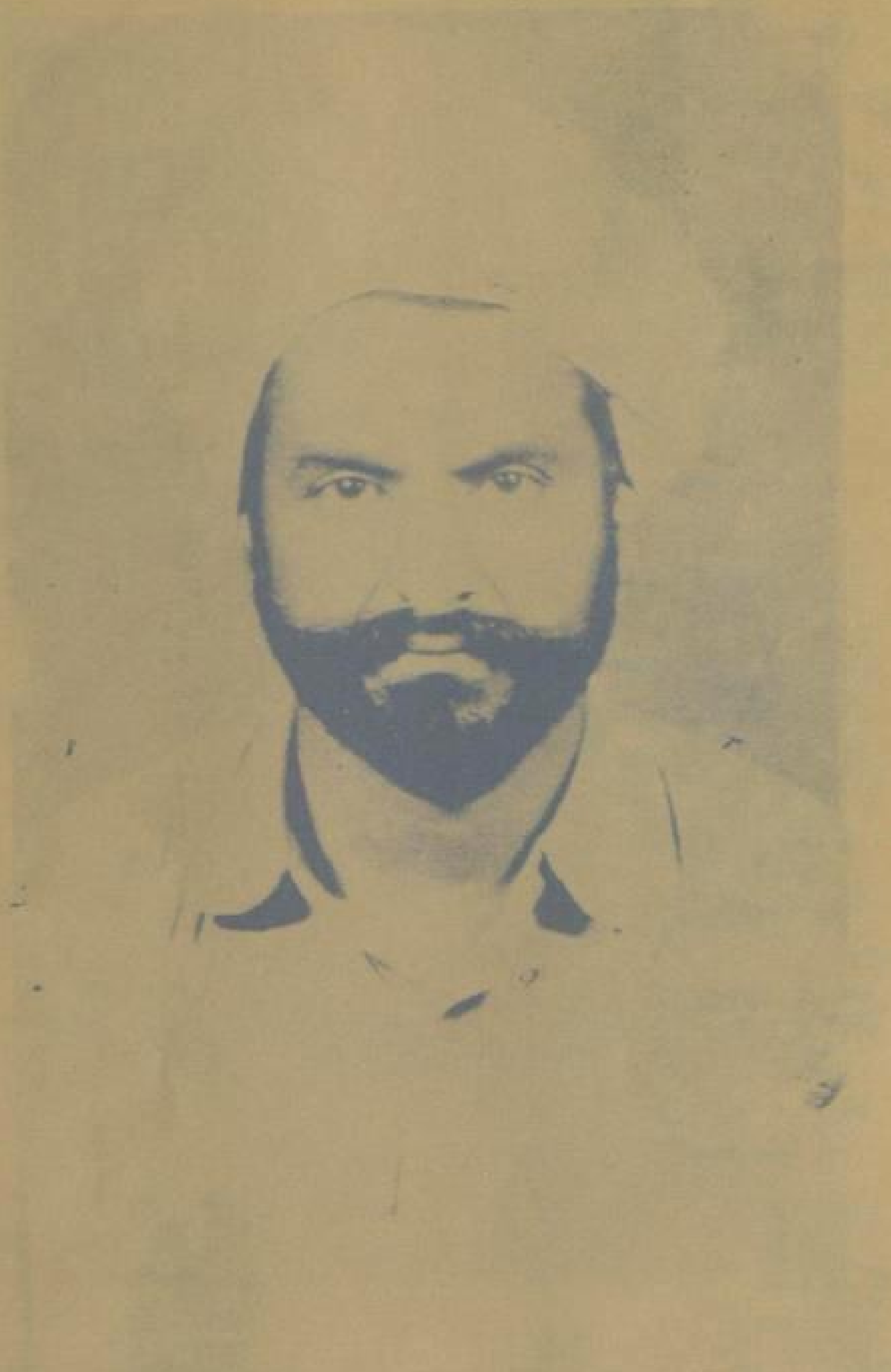

حُر مجاہد فورس کے سالار اعظم فقیر محمد امین منگریو جس نے تمام پاک وہند معرکوں

اور لڑائیوں میں مجاہد فورس کی کمان کی

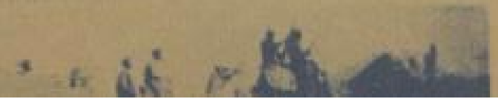

پاک و ہند جنگوں کے دوران حُر مجاہد فورس کے مناظر

پاک و ہند جنگوں کے دوران حُر مجاہد فورس کے مناظر

پاک و ہند جنگوں کے دوران حُر مجاہد فورس کے مناظر

"اللہ اکبر" اور " بھیج پاگارہ" کے نعروں سے گونج اٹھا۔

بھارتی سامراج حُر مجاہدوں کے جنگ میں شامل ہونے پر زیادہ مستعد ہوگیا۔ وہ پہلے کچھ کے رن اور کانجھی کوٹ کے دو معرکوں میں حُر مجاہدوں کے بہادرانہ کارناموں کو دیکھ چکا تھا۔ جب مجاہدوں نے بھارتی فوجوں کو ناک چنے چبوائے تھے۔ اس لیئے اس نے اپنی افواج کو اور زیادہ طاقتور بنانے کے لئے ان کو مزید کیل کانٹے سے لیس کر دیا۔

ایک طرف بھارت کی عظیم فوجی قوت تھی اور دوسری طرف پاکستان کی جری فوج اور حُر مجاہدین کا مشترکہ محاذ تھا۔ یہ باطل اور حق کے درمیان معرکہ تھا اور کفر سے اسلام کی جنگ تھی جس میں خدا تعالیٰ کے فضل سے پاکستان کو فتح و کامرانی حاصل ہوئی۔ اس جنگ میں حُر مجاہدوں نے چند ہی دنوں کے اندر بھارت کی متعدد چوکیوں پر قبضہ کرلیا۔ رہٹری۔ مونا باؤ۔ سوندرو مٹھڑائو۔ میان جر۔ پانچلو۔ چھوٹن وغیرہ جنوبی محاذ پر فتح کیئے گئے اور شمالی محاذ پر گھوٹاڑو کے قلعہ۔ شاہگڑھ۔ کشن گڑھ۔ سادن والی۔ بھٹان والی لونگی والی۔ رائچند۔ دھرمی۔ سرکاری ٹڑ وغیرہ پر قبضہ کیا۔ اس طرح حُر مجاہدوں نے اپنی عظیم جدوجہد اور حکمت عملی سے دشمن سے مقابلہ کرکے تقریباً بارہ سو مربع میل بھارتی اراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا ان چوکیوں میں سے جن پر بھارتی فوجوں سے حُر مجاہدوں کا زبردست مقابلہ ہوا۔ اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مونا باؤ بھارت کے ریگستانی علاقہ میں کھوکھراپار ریلوے لائن پر بھارت کا ایک بڑا شہر ہے۔ اور بین الاقوامی سرحد سے تقریباً ۲۰ - ۲۲ میل دور ہے۔ بھارت کی طرف سے اس شہر کی حفاظت

کے لئے مکمل انتظامات کئے گئے تھے۔ حُر مجاہدوں نے پاکستانی افواج کی نگرانی میں جب اس شہر پر حملہ کیا تو بھارتی فوجوں نے حملہ کو روکنے کے لئے اپنی پوری قوت کو استعمال کیا لیکن حُر مجاہدین "اللہ اکبر" اور "بھیج پاگارہ" کے نعرے لگاتے ہوئے بھارتی فوج پر لوٹ پڑے اور بھارتی سپاہی دم دبا کر بھاگ گئے اور ایکسو پچاس کے قریب فوجی پکڑے گئے مجاہدوں کے کوئی چار، پانچ افراد شہید ہوئے۔

چھوٹن

یہ جنوبی محاذ پر بھارت کی ایک اہم چوکی تھی۔ یہاں ایک برگیڈ بھارتی فوج متعین تھی اور ٹینکوں، توپوں اور جدید جنگی ساز و سامان سے لیس تھی۔ دوسری طرف حُر مجاہدوں کی صرف ایک کمپنی کو بھارتی فوج سے لڑنا تھا۔ اس مقابلہ میں مجاہدوں نے تمام حفاظتی انتظامات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ انہوں نے مورچوں کو استعمال کرنے سے گریز کیا۔ اور فجر کی نماز سے پہلے بھارتی چوکی پر حملہ آور ہوئے۔ بھارتی فوجی اس غیر متوقع حملہ سے بوکھلا گئے۔ اور اسی بوکھلاہٹ کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے اور حُروں نے چوکی پر قبضہ کرلیا۔ اس مقابلے میں بھارت کے ایک سو فوجی مارے گئے اور حُر مجاہدوں کے اٹھارہ افراد شہید ہوئے۔

سونڈرو

اس چوکی پر بھارت کی ایک برگیڈ فوج سے حُر مجاہدوں کی دو کمپنیوں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ بھی چھوٹن کے مقابلہ کی طرح سنگین تھا۔ لیکن حُر مجاہدوں کو اس میں فتح نصیب ہوئی اور ایک بھارتی کرنل اور درجنوں سپاہیوں کو گرفتار کیا گیا۔

ڈاھلی

یہ چوکی پاکستانی علاقہ میں ہے۔ اس پر بھارتی فوجوں نے حملہ کیا تب اور مجاہدوں کو دفاعی کردار ادا کرنا تھا۔ اسی طرح "جیسے کا پار"

چوکی پر بھی بھارتی فوجوں نے حملہ کیا تھا جسکو پسپا کرنا مقصود تھا۔ حُر مجاہدوں نے ان دونوں حملوں کا بڑی ہمت اور جرأت سے مقابلہ کیا اور مسلسل تین دن تک کھانے پینے اور آرام کرنے کا کوئی خیال نہ کرتے ہوئے بھارتی فوجوں کو بھگا دیا ان حملوں میں مجاہدوں کے صرف دو افراد شہید ہوئے۔

سرکاری ٹڑ

یہ دشمن کی اہم چوکیوں میں سے ایک تھی۔ جہاں بھارت کے ہزاروں کی تعداد میں فوجی متعین تھے اور مکمل طور پر مسلح تھے دوسری طرف حُر مجاہدوں نے اپنی خصوصی فوجی حکمت عملی سے کام لیکر تین طرف سے اس چوکی پر حملہ کیا۔ اور "اللہ اکبر اور بھیج پاگارہ" کے نعرہ لگاتے ہوئے دشمن کی صفوں پر بجلی بنکر لوٹے۔ دشمن اس حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس حملہ میں دشمن کے دوسو پچاس سپاہی مارے گئے اور چوکی پر حُروں کا قبضہ ہو گیا۔

گھوٹاڑو قلعہ

یہ قلعہ دور مغلیہ کی یادگار ہے اور مسلمانوں کے جاہ و جلال کو تازہ کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ قلعہ راجستھان کا حصہ ہے۔ جنگ کے دوران اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے متعدد حملے کئے گئے لیکن ناکام رہے اس قلعہ کی حفاظت کے لئے دشمن نے پچاس ٹینک۔ ایک سو سے زیادہ توپیں اور ایک بریگیڈ فوج متعین کر دی تھی۔ لیکن حُر مجاہدوں نے ساتویں بار بھرپور حملہ کر کے قلعہ کو فتح کر لیا اور پاکستان کا جھنڈا اس پر نصب کیا۔ اس معرکہ میں مجاہدوں کی نفری صرف ۴۵ تھی۔ گھوٹاڑو قلعہ کے معرکہ میں مجاہدوں کی فتح ایک معجزہ سے کم نہ تھی۔ جس پر مجاہدوں نے شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ لیکن دوسری طرف بھارتی فوجوں نے اپنی پوزیشن سنبھال کر قلعہ کو واپس لینے کے لئے بھرپور حملہ کیا۔ بھارتی ریڈیو نے دعویٰ بھی کیا کہ اس قلعہ کو واپس لے لیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُر مجاہدوں

نے اس حملہ کو بڑی جرأت اور بہادری سے پسپا کر دیا۔ بعد میں بھارت نے اعتراف کر لیا تھا کہ یہ قلعہ پاکستان کے قبضہ میں ہے۔

کشن گڑھ قلعہ

اس قلعہ کا اصل نام "دین گڑھ قلعہ" تھا جسے بھارتی سامراج نے تبدیل کر دیا تھا۔ اس قلعہ کی حفاظت کے لئے بھی بھارت نے ایک برگیڈ فوج۔ ٹینکوں اور توپوں سے مسلح کر کے رکھی تھی۔ دوسری طرف مجاہدوں کی تعداد تین سو تھی۔ مجاہدوں نے اس قلعہ پر بھی اپنی خصوصی حکمت عملی سے حملہ کیا اور چند گھنٹوں میں اس پر قبضہ کر کے بارود کے بڑے ذخیرے، رائفلوں مشین گنوں۔ جیپوں اور بھاری مقدار میں راشن کو حاصل کر لیا۔

دھرمی چوکی

یہ چوکی فوجی نقطہ نگاہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی یہ میدانی علاقہ تھا۔ اسلئے مجاہدوں کے لئے حملہ آور ہونا بیحد مشکل تھا۔ لیکن مجاہدوں کے ایک جیش کو چوکی کے عقب سے حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ جیش جب عقب میں پہنچا تو مجاہدوں نے سامنے سے فائرنگ شروع کر دی۔ بھارتی فوج نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی اور پوری توجہ سامنے والی فائرنگ پر دینے لگی۔ اس اثنا میں مجاہدوں نے عقب سے حملہ کر کے بھارتی فوجوں کو شکست دیدی۔ اس حملہ میں دشمن کی تین سو لاشیں گنی گئیں اور مجاہدوں میں سے بارہ افراد نے جامِ شہادت نوش کیا۔

سادلنوالی

اس چوکی پر قبضہ کرنا بیحد دشوار تھا۔ اسلئے کہ مجاہدوں کو تقریباً اکیسو میل اونٹوں پر یا پا پیادہ سفر کرنا تھا۔ اور درمیان میں نہ کوئی حفاظتی جگہ تھی اور نہ پانی کا انتظام۔ پھر بھی مجاہدوں نے تین دن کے اندر یہ سفر طے کر کے اچانک دشمنوں پر حملہ کیا۔ اس معرکہ میں دشمن جوابی حملہ کرنے سے بھی قاصر رہا۔ کیونکہ وہ بے خبر تھا۔ اور اُسے یہ بھی یقین تھا کہ اِس

دور دراز چوکی پر کسی کا حملہ آور ہونا ناممکن ہے۔

ان تمام معرکوں میں ایک سو کے قریب مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور تقریباً اتنے ہی مجاہدین زخمی ہوئے۔ لیکن جام شہادت نوش کرنے والے "اللہ اکبر" اور "بھیج پاگارہ" کے نعرے لگاتے ہوئے جاں بحق ہوئے مبارک ہو ان ماؤں کو جنہوں نے ایسے مجاہدین پیدا کئے اور صد مبارک ہو اس مجاہد اعظم حضرت پیر سائیں پاگارہ شاہ مردان شاہ ثانی کو جنہوں نے پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت اور نظریہ پاکستان کے مقصد کی خاطر اپنے مریدوں کی قربانیاں پیش کیں۔

ان معرکوں میں جن مجاہدین نے نمایاں اور قابل صد تحسین کارنامے انجام دیئے ان میں سے ایک فقیر محمد امین منگریو تھے جو ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی حُر مجاہدوں کے منتظم اعلیٰ تھے۔ ان خدمات کے صلہ میں اس مرد مجاہد کو حکومت پاکستان نے "ستارہ جرأت" کا تمغہ عطا کیا۔ لیکن ماضی قریب میں جب حُروں کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ جری مرد دو مرتبہ ڈی۔ پی۔ آر کے تحت گرفتار ہونے کے بعد نظروں سے غائب ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندہ ہے یا جام شہادت نوش کر چکا ہے۔ امین فقیر کے علاوہ جن مجاہدوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اُن میں سے قاضی فیض محمد۔ فقیر راجڑ۔ محمد یوسف کبر۔ محمد ابراہیم ہنگورجو۔ محمد عاقل ہنگورو۔ محمد سلیمان مہر۔ جمال فقیر منگریو۔ امید علی فقیر نظامانی۔ اربیلو فقیر کٹپر۔ جانو فقیر برڑو۔ ربو فقیر ٹانوری۔ اسحاق فقیر منگریو۔ مانک فقیر۔ اللہ ڈرایو فقیر دریامانی۔ جمال فقیر خاصخیلی۔ محمد بخش فقیر راجڑ۔ محمد اسمٰعیل فقیر راجڑ ترکو فقیر منگریو۔ عبداللہ فقیر منگریو۔ نصیر فقیر راجڑ۔ بیڑد فقیر راجڑ

منٹھار فقیر راجڑ۔ تاجو فقیر اد لھو۔ سکھیو فقیر خاصخیلی۔ امید علی فقیر بجرانی (شہید) جانن فقیر سنجرانی (شہید) داد فقیر لاکھو (شہید) اسماعیل فقیر سنجرانی پیرانو فقیر مہر۔ دریام فقیر خاصخیلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس جنگ میں مجاہدوں کو بھرتی کرنے، انہیں محاذ جنگ تک پہنچانے انکی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کے خاندان کو سنبھالنے کے لئے جن حُر لیڈروں نے اہم خدمات انجام دیں۔ ان میں میر محمد فقیر وسان۔ دھنی بخش فقیر نظامانی حاجی باغ فقیر راجڑ۔ حاجی حسین بخش فقیر راجڑ اور سہراب فقیر راجڑ تحسین کے حقدار ہیں۔

حضرت پیر سائیں پاگارہ نے اگرچہ یہ تمام خدمات حب الوطنی کے جذبہ اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کی خاطر انجام دیں۔ تاہم حکومت وقت کا یہ فرض تھا کہ وہ آپ کی ان خدمات کا قابل قدر صلہ دیتی۔ لیکن اس نے محض قومی اسمبلی کے ذریعے آپ کی خدمات کا اعتراف ایک قرارداد کی صورت میں کیا اور آپ کو "ہلال پاکستان" کا تمغہ دیکر یہ سمجھ لیا کہ اس نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرلیا حالانکہ اس مجاہد اعظم کو "نشان پاکستان" کا خطاب ملنا چاہئے تھا اور حُر جماعت کو قابل قدر انعامات ملنے چاہئے چاہئیں تھے۔ بہرحال پیر صاحب اس ناقدری سے شاکی نہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور اسکی سالمیت اور استحکام کا تحفظ کرنا ان کا فرض تھا۔ جس کا اجر انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملیگا۔ آپ کو افسوس صرف اس بات پر ہے کہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں ان کے مریدوں کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نہ مل سکے اور سازشوں کی وجہ سے مجاہدین تو کیا۔ خود مسلح افواج بھی اپنا کردار ادا نہ کرسکیں۔

پیر صاحب کی امن پسندی

ہم پچھلے صفحات میں بیان کرچکے ہیں

کہ پیر صاحب اپنی سجادہ نشینی کے بعد ان تمام حُروں کو حکومت کے ہاں پیش (SURRENDER) ہونے کے احکامات جاری کر دیئے تھے جن پر کشت و خون۔ بغاوت اور ڈاکہ زنی کے الزامات تھے اور جو پندرہ برس سے مفرور تھے اور حکومت انہیں گرفتار کرنے سے معذور تھی۔ پیر صاحب کے ان احکامات کو سنتے ہی تمام مفرور حُروں نے خود کو اپنے مرشد کے سامنے پیش کیا اور پیر صاحب نے انہیں حکومت کے حوالے کر دیا۔ چونکہ ان مفرور حُروں پر اکثر الزامات انگریزی دور کے تھے اور الزامات کے ثبوت بھی موجود نہیں تھے اسلئے ان پر چلائے جانے والے مقدمات سے اکثر باعزت بری ہو گئے۔ اس چیز سے تین باتوں کی تصدیق ہوتی ہے ایک یہ کہ حضرت پیر صاحب پاکستان کو اپنا وطن اور حکومت کو اپنی حکومت تصوّر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ حُر پاکستان کے وفادار شہری کی حیثیت میں اس ملک کے اندر رہیں۔ دوسری یہ کہ پیر صاحب ایک امن پسند شخصیت ہیں اور تیسری یہ کہ حُر اپنے مرشد کے حکم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ باوجودیکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان پر لگائے گئے سنگین الزامات کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی وہ اس خطرہ سے بے نیاز ہو کر خود کو قانون کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ڈاکوؤں سے مقابلے

سندھ میں کثرت سے ڈاکوؤں کے گروہ بنے ہیں اور اس علاقے کا امن درہم برہم کرتے رہے ہیں۔ ان گروہوں سے نپٹنے کے لئے حکومت کو لاکھوں روپے ایک طرف صرف کرنے پڑتے تھے اور دوسری طرف سندھ کے پُر امن شہریوں کی جان و مال اور عزت کو خطرہ رہتا تھا۔ ۶۹-۱۹۶۷ء کے دوران ڈاکوؤں کے ۲ گروہ پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا سرغنہ "کارو ماچھی" تھا اور دوسرے کا غلام عباس۔

کٹوہٹر، کارو ماچھی کے گروہ میں رمضان ماچھی۔ بڈھو ڈاہری۔ اقبال پنجابی۔ ملوک کلو اور غلام حیدر رہنگور د شامل تھے اور غلام عباس کے ٹولے میں غلام عباس کا بھائی گل حسن کٹوہٹر۔ مبین ڈاہری۔ صالح۔ تھیم اور اس کا بھائی احمد اور میاں بخش کھوسو۔ یہ گروہ دن دھاڑے ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔ پُرامن شہریوں کو چٹھیاں بھیجکر ان سے روپیہ حاصل کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کا پولیس پر اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ اسلیئے وہ اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت کے لئے ڈاکوؤں کو مطلوبہ رقم مہیا کرنے پر مجبور تھے۔ ایک مرتبہ تو کارو ماچھی کے گروہ کو پکڑنے کے لئے فوج کو بھی طلب کیا گیا جس نے سکرنڈ ضلع نواب شاہ کے ایک گھنے جنگل میں ڈاکوؤں کا محاصرہ کرکے بمباری بھی کی۔ لیکن کسی ایک ڈاکو کو بھی پکڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اس کے برعکس اس بمباری میں لاکھوں روپے کے مویشی تباہ ہو گئے اور جنگلات کو نقصان پہنچا۔

ان حالات میں اہل سندھ بھی پریشان ہوئے اور حکومت بھی مایوس ہوگئی آخر حکومت کو ایک بات سوجھی اور وہ تھی حضرت پیر سائیں پاگارہ سے حُروں کی امداد حاصل کرنا۔ اہلِ سندھ نے بھی حضرت پیر سائیں سے استدعا کی کہ وہ انہیں ڈاکوؤں کے مظالم سے بچائیں۔ اسلیئے پیر سائیں نے انتظامیہ اور عوام کی گذارش پر اپنے حُروں کو ہدایت کی کہ وہ ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے میں انتظامیہ کا ہاتھ بٹائیں۔ حُروں کو جیسے ہی یہ حکم ملا، وہ منظم ہو کر ڈاکوؤں کے پیچھے نکل پڑے ساٹھ حُروں کا ایک جیش تیار ہوا جن کو جمال فقیر خاصخیلی۔ علی شیر فقیر خاصخیلی اور لیمون فقیر سنجرانی کی قیادت میں تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان تینوں گروہوں نے تحصیل سکرنڈ، ضلع نواب شاہ کے جنگلات کو جس میں ڈاکوؤں کا گروہ چھپا ہوا تھا۔ محاصرہ میں لے لیا۔ لیکن ڈاکو وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اس

دوران انہوں نے موضع قاضی احمد ضلع نواب شاہ کے نزدیک، چھتن شاہ کے گاؤں کو لوٹ لیا۔ حُر فقیر بھی تعاقب میں تھے اور ایک گھنٹے کے بعد چھتن شاہ کے گاؤں پہنچ گئے۔ لیکن ڈاکو دریائے سندھ عبور کر کے سہون کے نزدیک "کنڈ بیلے" (ایک جنگل کا نام) میں جا کر چھپے۔ حُروں نے بھی دریا کو عبور کر کے کنڈ بیلے کا محاصرہ کیا۔ جہاں طرفین کے درمیان تین گھنٹوں تک زبردست فائرنگ ہوئی۔ آخر تمام ڈاکو حُروں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

اس مقابلہ میں جن حُروں نے حصّہ لیا۔ ان میں مذکورہ بالا تین حُر لیڈروں کے علاوہ ہیرانو فقیر مہر۔ اسحاق فقیر منگریو۔ فتح محمد فقیر خاصخیلی۔ مٹھو فقیر سنجرانی یعقوب فقیر سنجرانی۔ جان فقیر سنجرانی (شہید) دادن فقیر سنجرانی (شہید) امید علی فقیر سنجرانی (شہید) ولیو فقیر خاصخیلی اور بیلو فقیر کٹپر۔ سلیمان فقیر مہر اور گہنور فقیر جانگ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ واضح ہو کہ جن تین شہیدوں کے نام اوپر لکھے گئے ہیں وہ اس مقابلے میں نہیں بلکہ ۱۹۷۳ء کے دوران سانگھڑ میں شہید کیے گئے۔ باقی ڈاکوؤں کے مقابلہ میں کسی بھی حُر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا

دوسرا مقابلہ

یہ مقابلہ غلام عباس کنوہڑ کے گروہ سے ہوا۔ اس مقابلہ میں بھی حُروں کے تقریباً وہی مجاہد شامل تھے جو کارو ماچھی کے گروہ سے نبرد آزما ہوئے تھے یہ ۱۹۶۹ء کا دور تھا جب ڈاکوؤں کے اس نئے گروہ نے خلق خدا کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ اس گروہ کا تعاقب بھی تحصیل سکرنڈ کے "جاگیر بیلہ" نام کے جنگلات میں کیا گیا۔ ڈاکوؤں کو جب اس تعاقب کا پتہ چلا تو وہ "سن گاؤں" سے دریا عبور کر کے "رنی کوٹ" ہوتے ہوتے ہوئے اور "بھت پہاڑ" کو پار کر کے "بھگے ٹھوڑھے" پہاڑ میں جا کر مورچہ بند ہوئے۔ یہ حیدرآباد سے ۷۰۔۸۰ میل دور دادو ضلع میں واقع ایک پہاڑ

ہے ۔جو کہ ڈاکوؤں کی کیمپ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہتا تھا۔ حُر مجاہدین ریگستانی علاقہ کے باشندے تھے اور انہیں پہاڑی علاقہ کے پیچ وخم کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا۔ پھر بھی مجاہدین واپس نہیں لوٹے ۔انہیں اپنے مرشد کا حکم تھا کہ وہ ڈاکوؤں کو ختم کر کے ہی لوٹیں۔ اسلئے مجاہدین نے "بھگے ٹھوڑھے" پہاڑ میں جاکر ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا۔ جس میں ڈاکوؤں کے سرغنہ کا بھائی گل حسن کنٹوہٹر مارا گیا اور باقی سب ڈاکو پہاڑ عبور کر کے بلوچستان کے علاقہ کی طرف بھاگ گئے ۔اس مقابلہ میں دو حُر مجاہدین سلیمان مہر اور گنہور چانگ گولیوں سے زخمی ہوئے جنہیں حیدرآباد کے سول اسپتال میں لایا گیا۔ جہاں سے وہ صحتیاب ہو کر نکلے ۔

ڈاکوؤں کے ساتھ اس دوسرے مقابلہ کے بعد سندھ کے علاقہ میں امن بحال ہو گیا۔ مبین ڈاہری اپنے ساتھیوں کی گولی کا لقمہ بنا اور دوسرے ڈاکو یا تو چھپ گئے یا مر گئے۔ اس طرح حُر مجاہدوں کے ڈر کی وجہ سے پھر ڈاکوؤں کا کوئی نمایاں گروہ نہ بن سکا ۔

لسانی فسادات

لسانی فسادات کے دوران حضرت پیر سائیں پاگارہ کی امن پسندی کا ذکر ہم اس سے پہلے بھی کر چکے ہیں ۔ان فسادات میں سندھ کے دوسرے حصوں میں بہت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ لیکن جن اراضیوں میں حضرت پیر سائیں پاگارہ کی جماعت اکثریت میں ہے یا زیادہ اثر رکھتی ہے وہاں فساد کی کوئی ایک واردات بھی نہ ہوئی اسلئے کہ حضرت پیر سائیں نے اپنے مریدوں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فسادات کو روکنے کی کوشش کریں ۔چنانچہ جہاں پیر سائیں کے مریدوں نے فساد کا کوئی خطرہ محسوس کیا، وہاں راتوں کو پہرہ دیکر ایسے خطروں کو ٹال دیا ۔انھوں نے نہ صرف

غیر سندھیوں کو سندھیوں کے امکانی حملوں سے بچایا بلکہ سندھیوں پر بھی پر بھی غیر سندھیوں کو ہاتھ اُٹھانے سے روکا۔ حضرت پیر سائیں کی اس خدمت کا اعتراف جمیعت علماء اسلام کے ایک لیڈر اور ایم۔ این۔ اے مولانا عبدالحکیم جو کہ سندھ کے حالات کے جائزے کے لئے سندھ میں ایک کمیٹی کے ساتھ آئے تھے اور سندھ کا دورہ کیا تھا اپنے ایک بیان میں کیا اور کہا کہ جہاں جہاں حضرت پیر سائیں کے مریدوں کا اثر تھا وہاں بالکل امن رہا۔

حضرت پیر شاہ مردان شاہ ثانی مدظلہ

اور

دینی خدمات

جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں کئی بار اس بزرگ خانوادہ کی دینی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ اب اس باب میں بھی ایک مختصر تعارف اور خاکہ پیش کیا جاتا ہے قارئین کو خوب یاد ہو گا کہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید علی رح بھی سندھ میں اشاعتِ دین کی خاطر وارد ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے نقوش قدم سے جو راہ بنائی تھی اس پر ان کی آئندہ نسلیں قدم بقدم گامزن رہیں حتیٰ کہ حضرت پیر سائیں محمد راشد (روضے دھنی) رحمۃ اللہ علیہ اس راہ میں شمع بنکر چمکے اور پھر رشد و ہدایت کی قندیلیں کچھ اس طرح روشن ہوئیں کہ چراغ سے چراغ جلتے گئے حتیٰ کہ پنجاب۔ بھاولپور۔ بلوچستان۔ سندھ اور راجستھان ان کی ضو سے منور ہو گئے۔ اہلِ علم اور صاحب دل جب بنظرِ غائر ان علاقوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہر قریہ اور ہر دیہہ میں ایسے کئی چراغ جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسلام کوئی پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے۔ کہ بس چند رسومات کی ادائیگی سے نجات حاصل ہو جائے گی نہ یہ اس بات کا قائل ہے کہ "خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا حصہ قیصر کو" بلکہ یہ پیہم رواں دواں زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں

اولادِ آدم کی سعادت کا پاسباں اور قیامت تک کے لئے اشارہ کناں ہے کہ اس ازلی اور ابدی فیضان سے دامن بھر لو۔ اور پھر دوسروں کو دعوت دو تاکہ کوئی اس سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ "جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ" کے مطابق اللہ کے نیک بندے ہر رنگ میں شجرِ اسلام کی آبیاری کرتے اور اسکی خوشبو کو اکنافِ عالم میں پھیلانے کی کوشش میں سدا جوان رہتے ہیں اس شجرِ طیب کی خوشبو۔ مٹھاس۔ چھاؤں اور شفقت کا احساس دلانے والے بڑے ہی خوش نصیب ہیں جو اللہ کی مخلوق کو اضطراب۔ یاس اور بے رہروی سے نجات دلانے میں ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ تاکہ مالکِ حقیقی ان سے راضی ہو جائے جو عین مقصدِ حیات ہے۔

جہاد بالسیف۔ جہاد بالقلم۔ جہاد باللسان اور جہاد بالمال۔ اشاعت اسلام کی چند نمایاں صورتیں ہیں اور تاریخ اسلام کے ان گنت ستارے انفرادی اور اجتماعی طور پر ان صورتوں میں ایک ایک یا دو دو میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن حضرت پیر سائیں کا خانوادہ اس سلسلے میں منفرد خصوصیت کا حامل ہے یعنی یہ بزرگ ان تمام خوبیوں سے بیک وقت مزین تھے۔ انہوں نے وقت پڑنے پر تلوار اٹھائی اور جانبازوں کی ایک جماعت تیار کر دی۔ مال لٹانے پر آگئے تو دریا بہا دیئے۔ علم و عمل کے چراغ روشن کئے۔ سیرت و کردار کے انوکھے نمونے پیش کئے۔ شہادت۔ غزا۔ سخاوت۔ ہدایت اور اشاعت غرض ہر میراث میں ان کے نقوشِ پا دوسروں کو دعوتِ عمل دیتے ہیں۔

ہم دوسرے بزرگوں کا ذکر گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ اگرچہ ان سب کی خدمات کا احاطہ کرنا امر محال ہے۔ اب آئندہ چند صفحات میں موجودہ پیر سائیں پاگارو کی دینی خدمات کا ایک تعارف پیش کرتے ہیں۔

جامعہ راشدیہ

پیر گوٹھ (کنگری) ضلع خیرپور میں جہاں اس خاندان کے بزرگوں کے مقابر اور محلات ہیں۔ جامعہ راشدیہ کے نام سے اشاعتِ اسلام کا ایک وسیع و عریض مرکز حضرت پیر سائیں کوٹ دھنی نے قائم کیا تھا اور اپنے بزرگوار مورث حضرت پیر سائیں محمد راشدؒ کے نام نامی پر اس جامعہ کا نام جامعۂ راشدیہ رکھا تاکہ ان کا فیضان جاری رہے۔ چنانچہ "تفسیر کوثر" اسی مدرسہ کے فیضان کا شاہکار ہے۔ جسے حضرت کوٹ دھنیؒ نے چھپواکر پوری جماعت میں مفت تقسیم کیا تاکہ اشاعت اسلام میں صدقہ جاریہ کا تسلسل قائم رہے۔ اُس وقت اس مدرسہ کی عمارت میں چھ کمرے۔ ایک بڑا ہال باورچی خانہ اور عظیم الشان لائبریری شامل تھے۔ لیکن جب انگریزوں کے جبر و استبداد کا عفریت حرکت میں آیا تو ان سب کو ویران کرگیا۔ بُلبلیں شاخ سے پرواز کرگئیں اور خزاں زدہ شجر قزاقوں کی دستبرد سے تصویر حسرت بنکر رہ گیا۔ لائبریری کی نادر قلمی کتابیں اور مخطوط کچھ تو لنڈن کے انڈیا آفس کی لائبریری کی زینت بن گئے اور کچھ اپنے ہی مار آستین لے اُڑے۔ اس طرح حوادث کی آندھیاں اس علمی خزانے کے اوراق کو ملیامیٹ کرگئیں۔

موجودہ پیر سائیں پاگارہ حضرت شاہ مردان شاہ ثانی مدظلہٗ جمادی الاول ۱۳۷۱ھ بمطابق ۴ فروری ۱۹۵۲ء میں جب مسند نشین ہوئے تو انہوں نے اس طرف خصوصی توجہ فرمائی اور اپنی پہلی فرصت میں اس درسگاہ کی تعمیر و تربیت میں مشغول ہوگئے۔ چنانچہ ۲۴ مئی ۱۹۵۲ء کو جامعہ راشدیہ کی پرانی عمارت میں نئی عمارات کی بنیاد رکھی گئی۔ اور چھ کمروں کی بجائے ۲۹ کمرے تعمیر کیے گئے جن میں طلبا کے لئے رہائش اور خوراک کا مفت انتظام ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں کپڑوں اور علاج معالجہ کی سہولتیں بھی ہیں۔ کلاس روم کے طور پر نو کمرے ایک لیکچر

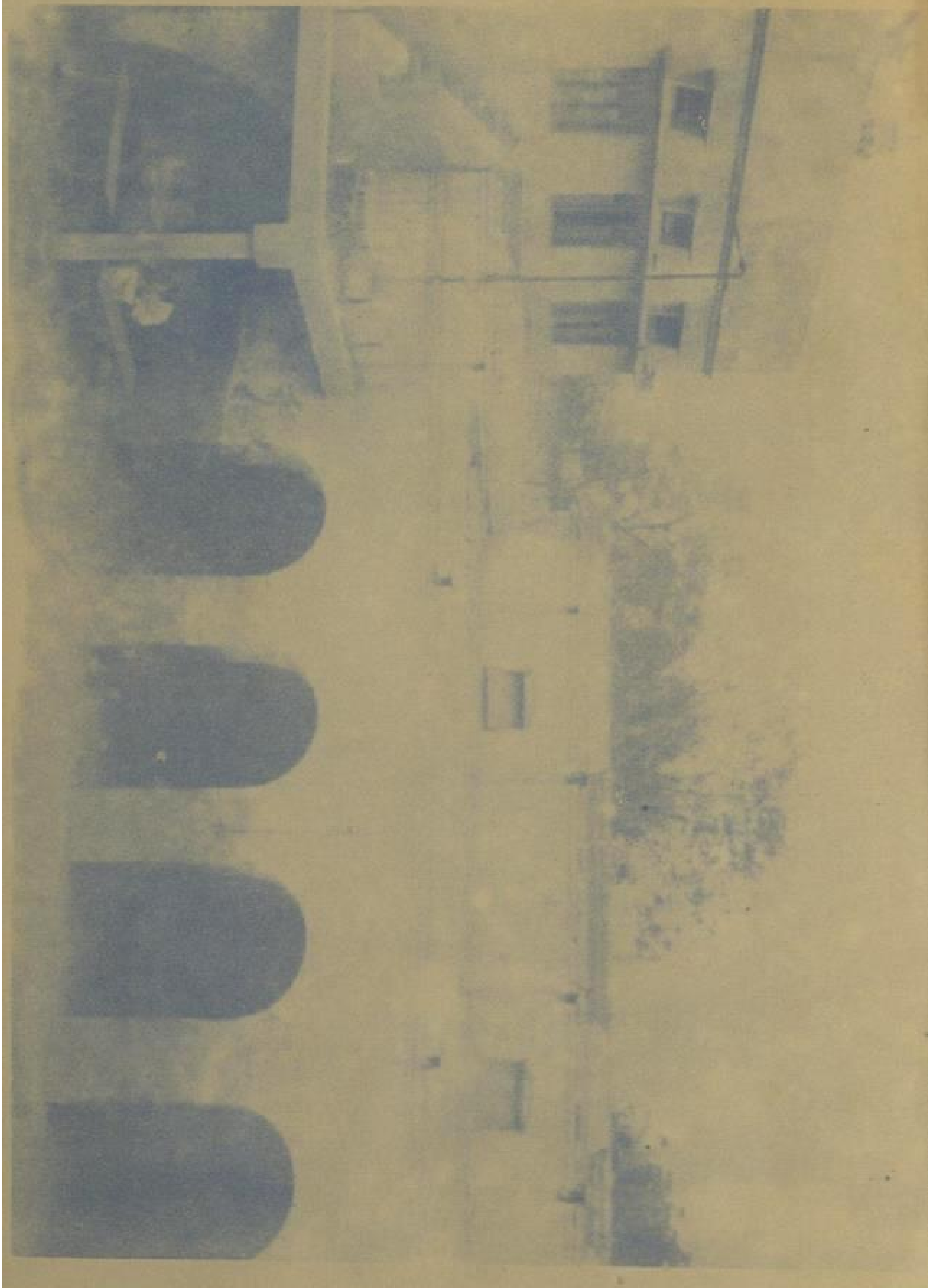

(اوپر) جامعہ راشدیہ کی لائبریری اور دار القرآن

(نیچے) اور طلباء کی اقامت گاہ

ہال۔ لائبریری ہال۔ گیلری نما امتحان گاہ۔ بارہ کمرے طلبا کی رہائش کے لئے اور باقی اساتذہ کی رہائش کے لئے مخصوص ہیں۔ جنھیں خوراک بھی بلا معاوضہ مہیا کی جاتی ہے۔

حضرت پیر سائیں نے اس درسگاہ کو مثالی بنانے کے لئے بڑی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے پروگرام میں طلبا کو عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے آراستہ کرنا بھی شامل تھا۔ اس لئے اساتذہ کے انتخاب میں انہوں نے دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس جامعہ میں مندرجہ ذیل اساتذہ کام کرچکے ہیں یا اب بھی کررہے ہیں۔

۱ــ مفتی محمد صاحبداد رحمۃ اللہ علیہ	شیخ الجامعہ
۲ــ مولانا محمد صالح	پرنسپل
۳ــ مولانا تقدس علی خاں	شیخ الحدیث
۴ــ استاذ حسین امام	شیخ المعقول
۵ــ استاذ محمد علی ازہری	شیخ الادب
۶ــ استاذ کریم بخش	صدر مدرس
۷ــ استاذ عبدالصمد	صدر مدرس
۸ــ قاری محمد حنیف	شعبۂ قرأت
۹ــ حاجی رضا محمد	استاذ قرآن ناظرہ

اس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہونے والے بزرگوں اور علما کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔

یہاں درس وتدریس کے ذریعے بحث مباحثہ۔ مکالمات۔ فتوے نویسی عربی۔ فارسی۔ سندھی خوشخطی وغیرہ کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ فارغ التحصیل

طلبا۔ مساجد۔ مدارس۔ اسکول اور کالج وغیرہ کے لئے بہترین مبلغ۔ امام۔ قاضی مفتی۔ استاد اور لیکچرر بن سکیں۔ سیرت و کردار کی تعمیر و پختگی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس مرکز سے بے شمار خطیب۔ استاذ۔ کاتب۔ مفتی۔ قاری اور حافظ تیار ہو کر اشاعت اسلام میں مشغول ہیں۔

حضرت پیر سائیں نے مختصر عرصہ میں تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ تاریخ۔ لغت اور ادب کی بہترین کتابیں اپنے صرف خاص سے خرید کر اس درسگاہ کی لائبریری کے لئے وقف کی ہیں۔ چنانچہ اس وقت لائبریری میں ۵۰ قلمی کتابیں اور تقریباً ساڑھے تین ہزار مطبوعہ کتب موجود ہیں۔ لیکن یہ معاملہ یہاں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ خود کارپردازان درسگاہ اور حضرت پیر سائیں اپنے اپنے مقام پر اس لائبریری کی توسیع کے لئے کوشاں ہیں۔

اس درسگاہ میں سہ ماہی امتحانات کے بعد سالانہ امتحان ہوتا ہے درسگاہ کا اپنا ایک معیار ہے جس پر پورا اترنے والے کو سند دی جاتی ہے اور یہ بات نہایت وثوق سے کہی جاتی ہے کہ یہاں سے کسی غیر معیاری طالب علم کو آج تک سند نہیں دی گئی۔ سندات کی تقسیم کا کام خود حضرت پیر سائیں اپنے دست مبارک سے سرانجام دیتے ہیں۔ اور اس موقع پر آپ کی تقریر کے نمایاں پیغامات مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔

I۔ "آپ حضرات کو اس درسگاہ میں جس محنت و خلوص سے تعلیم دی گئی ہے۔ اگر آپ اسی جوش و جذبہ اور خلوص سے کام کرتے رہے تو انشاء اللہ ہر جگہ کامیاب و کامراں رہیں گے۔

II۔ "آپ حضرات کو اپنے بزرگوں کے خلوص اور للہیت کا مطالعہ کرنا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔ اسی میں سربلندی کا راز ہے

III آپ حضرات سے کوئی ایسی لغزش نہیں ہونی چاہیئے جو اس درسگاہ
کے وقار کے منافی اور اس سے حاصل کردہ علم و فضل کے منافی ہو کیونکہ
اس سے آپ کے بزرگوں پر دھبہ آئیگا۔

IV آپ حضرات کا کام حق و صداقت کی تبلیغ ہے۔ تفرقہ بازی سے آپ کو
کیا سروکار، یہ تو علم و عمل کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ اس سے پرہیز کرتے رہیں
حضرت پیر سائیں کے یہ اقوال حروفِ زرّین سے لکھنے کے قابل ہیں اور
بلاشبہ درسگاہ کے فارغ التحصیل طلبا کے علاوہ ہر مسلمان کے لئے خضرِ راہ ہیں
ان پیغامات سے ہی درسگاہ کے معیار اور مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس درسگاہ کی شاخیں تقریبًا سارے سندھ میں موجود ہیں۔ صرف ضلع
سانگھڑ میں چھ شاخیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ ان تمام شاخوں سے فارغ ہونے والے
طلبا کو بھی سندات جامعہ راشدیہ سے ہی ملتی ہیں۔ یہ طلبا تراجم اور تصانیف
سے بھی غافل نہیں ہیں۔ چنانچہ جامعہ کے ایک فاضل مفتی ڈر محمد صاحب نے حضرت
پیر سائیں روضے دھنیؒ کے ملفوظات کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے جس کا چوتھا حصہ
شائع ہو کر فروخت ہو رہا ہے۔ اس میں خاص طور پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان ملفوظات
کی طباعت اور اشاعت کے لئے تمام رقوم کا بندوبست ان علما حضرات نے خود
کیا ہے۔ اب پانچواں حصہ شائع ہو رہا ہے۔ جامعہ کے ایک دوسرے فاضل مفتی
محمد رحیم صاحب نے قرآن پاک کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن کاغذ کی نایابی اور
طباعت کی گرانی کی وجہ سے ابھی تک طبع نہیں ہو سکا ہے۔ جامعہ کے ایک اور فاضل
مفتی عبدالرحیم صاحب نے "میلاد النبی" نامی کتاب لکھ کر اہلِ السنت والجماعت
سے داد تحسین حاصل کی ہے۔ یہ دونوں حضرات بالترتیب جامع مسجد لوہار گلی شہدادپور
اور جامع مسجد نزد بس اسٹاپ شاہ پور چاکر ضلع سانگھڑ میں امامت کے فرائض

سرانجام دے رہے ہیں۔ جامعہ کی طرف سے تراجم اور تصانیف کا ایک منظم سلسلہ موجود ہے
الغرض جامعہ راشدیہ حضرت پیر سائیں کی سرپرستی میں اشاعتِ اسلام کے لئے دن رات کوشاں ہے۔

مدرسہ صبغۃ الاسلام سانگھڑ

ضلع سانگھڑ کو حُر مجاہدین کے مرکز کی حیثیت رہی ہے حضرت پیر سائیں کا بنگلہ جسے گڑنگ یا گننگ کہتے ہیں۔ سانگھڑ سے میرپور والی روڈ پر تقریباً تیسرے میل پر واقع ہے۔ اس بنگلہ پر انگریزوں نے بمباری کی تھی جس کے آثار ابتک موجود ہیں اور برباد شدہ بنگلہ اسی حالت میں موجود ہے۔ مکھی ڈھنڈ کا علاقہ جس میں سے نارا کینال بہتی ہے۔ گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور سانگھڑ شہر ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ جو نظامانیوں کا گڑھ تھا۔ یہ برادری آج تک اس خاندان کی وفادار ہے ان کی دینی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی محلہ میں صبغۃ الاسلام کے نام سے ۱۹۶۲ء میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی موجود ہے۔ اس مدرسہ کی تعمیر اور اجراء میں جامعہ راشدیہ کے پرنسپل مولانا محمد صالح صاحب کا بڑا دخل ہے۔ اس کے سرپرستِ اعلیٰ بھی حضرت پیر سائیں پاگارو ہیں۔

مدرسہ کے اساتذہ کرام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا ارباب علی کھوسہ صاحب۔ جو جامعہ راشدیہ کے فارغ التحصیل اور مولوی عالم ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء والی ہندو پاک جنگوں میں حُر مجاہدین کی جماعت میں شریک رہے ہیں۔

۲۔ قاری علی محمد صاحب۔ جو استاذ القراء محمد طفیل نقشبندی سے سند یافتہ ہیں آپ ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگ میں شامل رہے ہیں۔

۳۔ مفتی دُرمحمد صاحب۔ آپ نے ملفوظات حضرت روضے دھنی کا فارسی سے سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء والی ہند و پاک جنگ میں آپ نے بھرپور حصہ لیا تھا۔

اس کے علاوہ ضرورت کے مطابق اساتذہ کا تقرر کر لیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں مدرسہ کے چھ طالب علم علوم مشرقی کے مختلف امتحانوں میں شریک ہوئے اور سب کامیاب رہے۔ مدرسہ میں زیادہ تر شہر کے طالب علم ہیں جو باہر سے آتے ہیں۔ ان کے لئے رہائش اور خوراک کا انتظام بھی ہے۔ مدرسہ میں عربی۔ فارسی اور سندھی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرأت۔ حفظ اور تجوید کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ گذشتہ رمضان میں جامع مسجد میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی زیر صدارت قرأت کا جو مقابلہ ہوا تھا اس میں پہلا انعام مبلغ ایکسو پچاس روپے اسی مدرسہ کے ایک قاری غلام محمد نے حاصل کیا تھا۔ یوں تو اس مدرسہ کے بے شمار طالب علم تکمیل درس کے بعد مختلف اطراف میں خدمت دین کر رہے ہیں تاہم چند ایک حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا ارباب علی کھوسو	۲۔ مولانا غلام عباس بگھیو
۳۔ مولانا محمد اسماعیل بگھیو	۴۔ مولانا شاہ محمد قاضی
۵۔ مولانا سائیں رکھیو	۶۔ مولانا عبدالرشید
۷۔ مولانا نذیر احمد مینگل	۸۔ مولانا غلام محمد کھوسو
۹۔ حافظ رسول بخش وسان	۱۰۔ حافظ قاری علی محمد
۱۱۔ حافظ عبدالغفور	۱۲۔ حافظ فضل الرحمٰن مہاجر
۱۳۔ قاری جمیل احمد	۱۴۔ قاری بشیر احمد
۱۵۔ حافظ عبدالرحیم	۱۶۔ مولانا محمد بخش

یہ سب حضرات اس وقت سندھ کے مختلف مدارس میں عربی ٹیچر اور مختلف

مساجد میں خطیب ہیں۔

مدرسہ کی لائبریری میں ضرورت کے مطابق کتابیں تو ہیں مگر ابھی توسیع کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں کوششیں جاری ہیں۔ اس مدرسہ کے کئی طالبِ علم ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء والی ہندو پاک جنگوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ مدرسہ کے معائنہ کی خاطر بڑے بڑے بزرگ مثلاً مخدوم امیر احمد مرحوم۔ پیر غلام مجدّد سرہندی۔ مولانا محمد صالح جامعہ راشدیہ۔ مولانا شاہ احمد نورانی۔ مولانا محمد حسن حقانی وغیرہ یہاں تشریف لا چکے ہیں۔

مدرسہ سے ملحق مسجد کا نام "کوثر مسجد" ہے۔ جس کا سنگِ بنیاد ۱۴ محرم ۱۳۸۴ھ میں سید غوث محمد شاہ جیلانی نے رکھا اور مفتی دُرّ محمد صاحب نے صلوٰۃ وسلام کے بعد انیٹیں رکھیں۔ مدرسہ کے موجودہ سکریٹری جنرل جمال الدین نظامانی ہیں۔ یہ مدرسہ سانگھڑ شہر میں خانوادۂ پیرانِ پاگارہ کی روشن کردہ شمع ہے جو علم و فضل کی جوت جگا رہا ہے۔

مدرسہ صبغۃ الانوار گوٹھ فیض محمد کھمبھر متصل سانگھڑ

یہ مدرسہ جامعہ راشدیہ کی برانچ ہے۔ اور حال ہی میں کھلا ہے جناب پیر فتح محمد شاہ صاحب اس کے منتظم ہیں اور مولانا غلام نبی صاحب کھوسہ (مولوی فاضل) اور فارغ التحصیل جامعہ راشدیہ صدر مدرس ہیں۔ سردست یہ مدرسہ گوٹھ کی جامع مسجد میں قائم ہوا ہے اور مقامی طلباء فارسی۔ حفظ وناظرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

دارالعلوم قادریہ شہدادپور (سانگھڑ)

یہ نوزائیدہ درسگاہ۔ مدرسہ عالیہ جامعہ راشدیہ کی ایک اہم اور

ترقی پذیر شاخ ہے۔ حضرت قبلہ پیر سائیں پاگارہ کے فیضانِ نظر سے شہدادپور کی جماعت اہل سنت وجماعت نے یہ دینی ادارہ قائم کیا۔

پروگرام کے مطابق مدرسہ میں آٹھ کمرے تعمیر ہوئے ہیں۔ ابتک تین کمرے مکمل ہو چکے ہیں مزید تعمیر ہونے کا پروگرام باقی ہے۔

دارالعلوم میں تعلیم کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ حفظ۔ ناظرہ تجوید۔ قرأت۔ فقہ وحدیث وتفسیر و دیگر جدید و قدیم فنون کی تعلیم جدید خطوط پر دیجارہی ہے۔ آگے چلکر اسی مدرسہ میں قادریہ اورینٹل کالج بھی قائم کیا جائیگا۔

اس وقت مدرسہ میں پانچ عربی کے طالب علم۔ فارسی کے چار۔ حفظ میں سات اور باقی ناظرہ تعلیم لے رہے ہیں۔ مسافر طلبا پچیس ہیں۔ جبکہ مقامی طلبا ستر سے متجاوز ہیں۔

دارالعلوم میں تعلیم بالغان کا بھی اہتمام موجود ہے۔ مدرسہ کے سالانہ اخراجات چوبیس ۲۴ ہزار کے قریب ہیں۔ قیام و طعام۔ لباس۔ علاج اور دیگر اخراجات مدرسہ کے ذمہ ہیں۔ مولانا قاری عبدالرزاق صاحب اور مولانا غلام عباس صاحب قرآن کریم۔ قرأت۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم دیتے ہیں۔ جبکہ مفتی محمد رحیم افتاء کے فرائض کے ساتھ فقہ۔ حدیث۔ تفسیر اور بقیہ فنون کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور وہی مدرسہ کے مہتمم ہیں اور ایک کمیٹی کے تعاون سے مدرسہ کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

مدرسہ صبغۃ الفیض سومر فقیر ہنگورہ شہدادپور

مدرسہ صبغۃ الفیض ۱۳۸۳ھ میں حضرت قبلہ پیر سائیں پاگارہ کی نیضانِ نظر سے قائم ہوا۔ اور آپ ہی مدرسہ کے سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔

حضرت پیر عبدالحکیم صاحب کے اہتمام میں مدرسہ نے اب تک شاندار خدمات سرانجام دی ہیں، درجن سے زیادہ طلبا فارغ ہوکر مختلف مساجد۔ مدارس اور بستیوں میں امامت۔ استاذ اور خطیب کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

مدرسہ میں سات کمرے۔ دو برآمدے اور ایک عظیم الشان لائبریری ہے۔ نیز مدرسہ میں عالی شان پارک بھی ہے۔ اسوقت تک جو مختلف اساتذہ تعلیم دے چکے ہیں یا دے رہے ہیں وہ ہیں مولانا عبدالخالق صاحب۔ مولانا ولی محمد صاحب۔ مولانا فضل محمد صاحب۔ مولانا میر محمد صاحب اور مفتی محمد رحیم

مدرسہ میں اس وقت تیرہ عربی کے طالب علم ہیں۔ سات بچے فارسی میں۔ دو حفظ میں باقی ناظرہ تعلیم پا رہے ہیں۔ مسافر طلبار بائیس ۲۲ ہیں جب کہ مقامی طلباً پچاس سے زائد ہیں۔

مدرسہ کے اخراجات بیس۲۰ ہزار کے قریب ہیں۔

مدرسہ صبغۃ الھدیٰ پنگریہ

یہ مدرسہ بھی حضرت قبلہ پیر سائیں پاگارہ کی سرپرستی میں ۱۹۶۸ء کو قائم ہوا۔ مدرسہ جامع مسجد پنگریہ سے متصل تین پختہ اور وسیع صحن پر مشتمل ہے۔

مدرسہ کے مہتمم حاجی بشیر احمد صاحب میمن بی۔اے۔بی ٹی۔ ایم۔اے ہیں۔ اساتذہ میں مولانا عبدالعزیز صاحب کھوسہ مولوی فاضل اور جامعہ راشدیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ حفظ و تجوید الحاج قاری احمد صاحب پڑھاتے ہیں۔ مدرسہ میں داخل طلبار سو کے قریب ہیں۔ جن میں ۱۷ طلبار کے تمام اخراجات مدرسہ کے ذمہ ہیں۔

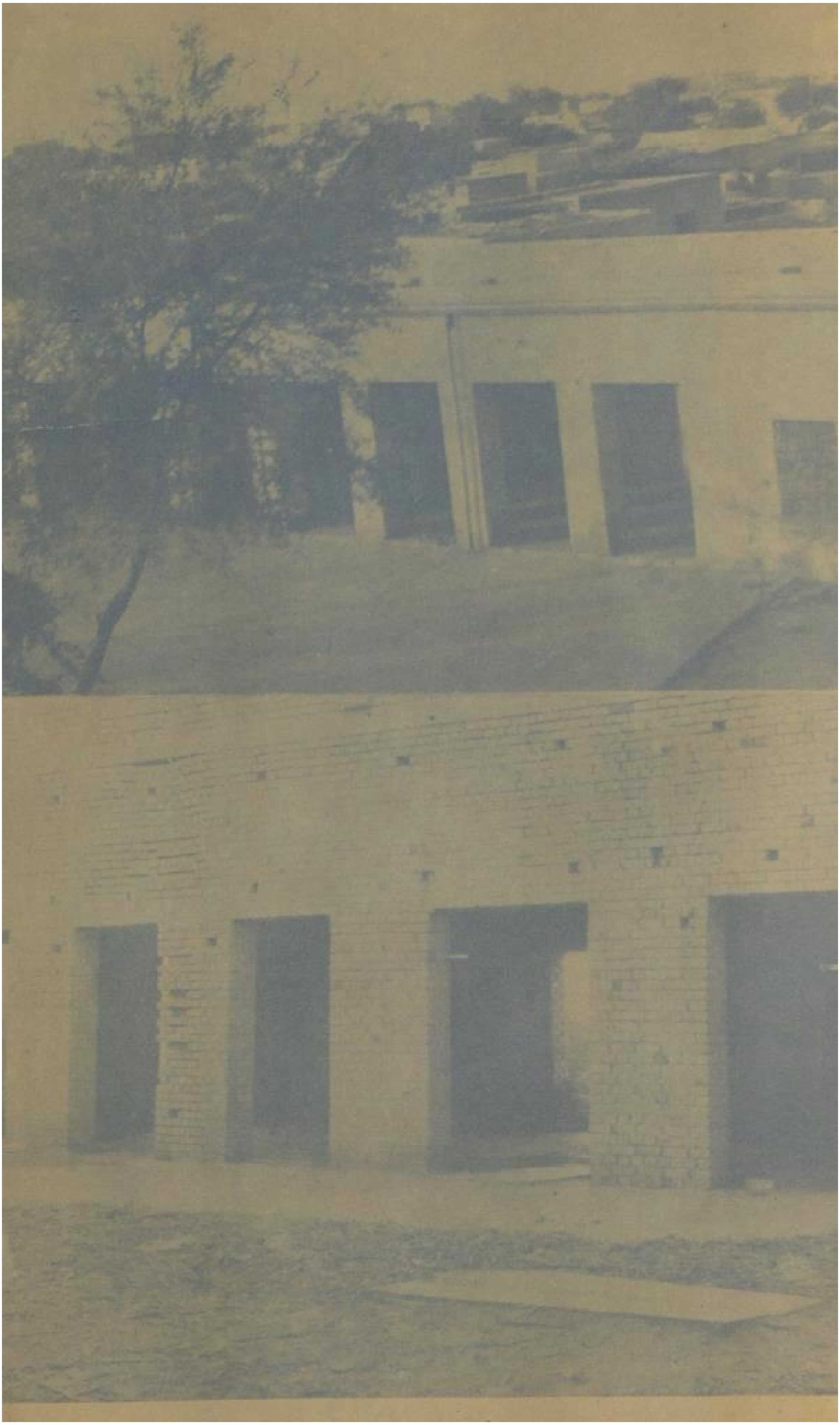

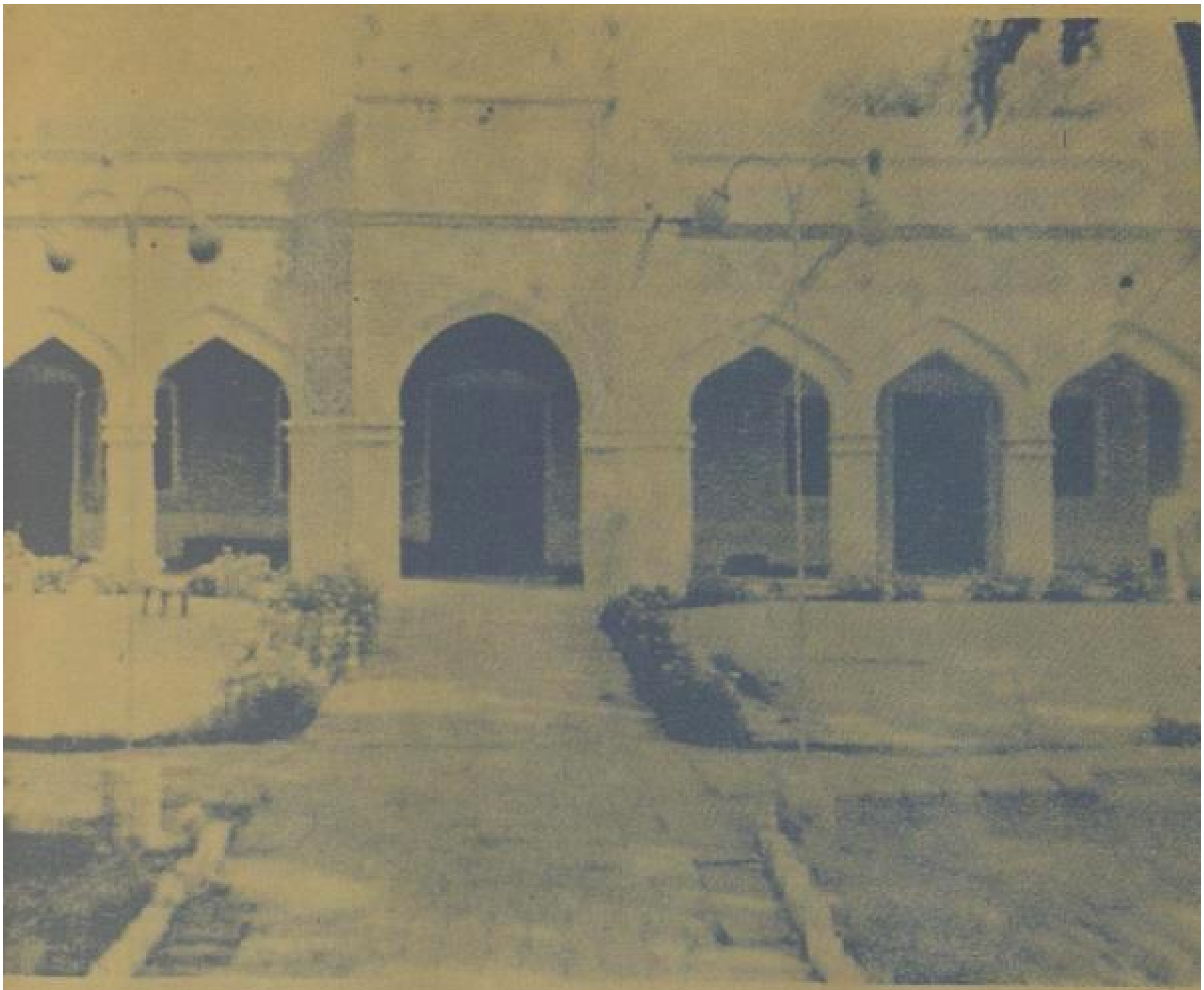
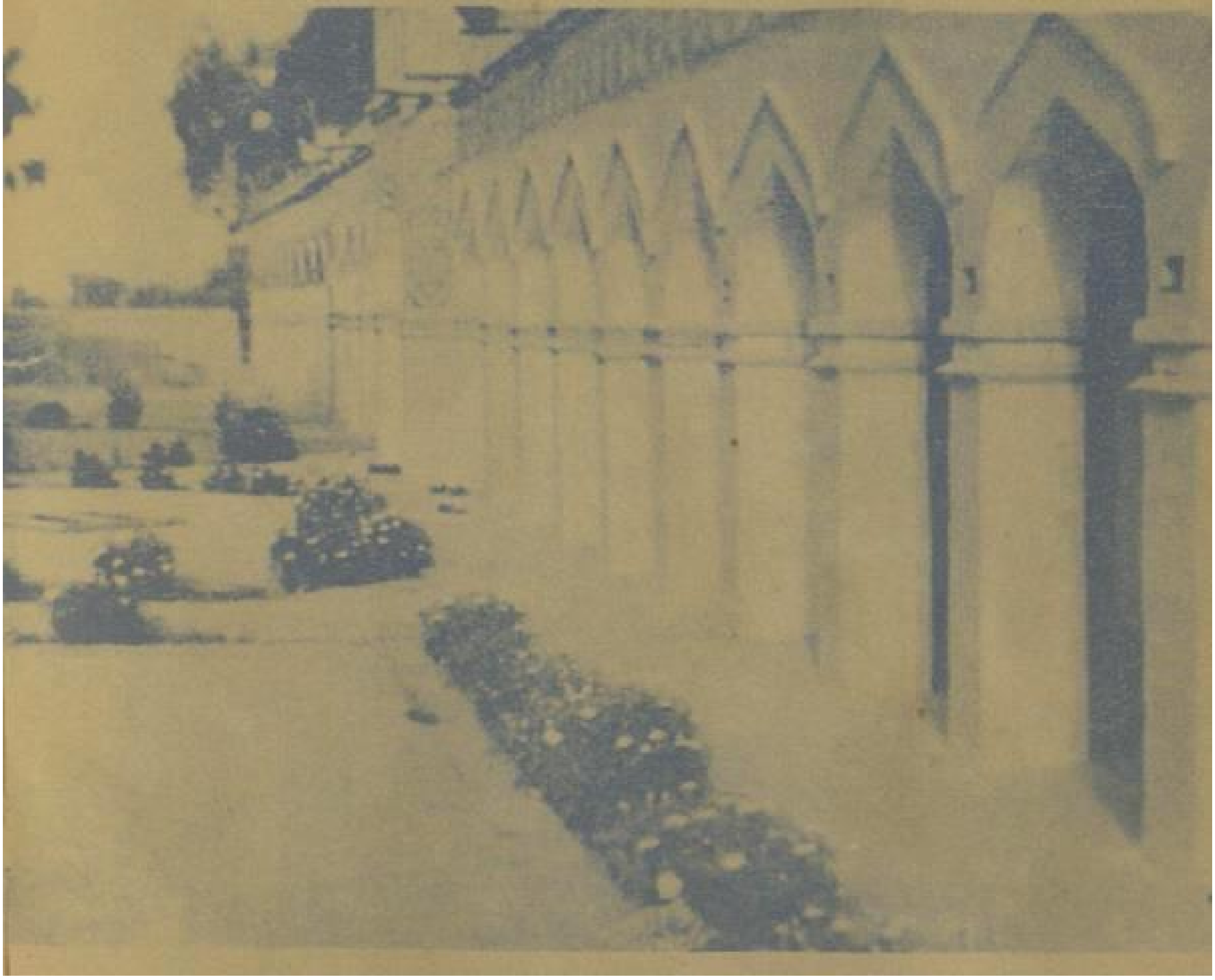

اسلامیہ ہائی اسکول کھپرو ضلع سانگھڑ

یہ ہائی اسکول ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۱ء تک حُرجماعت کی کوشش سے چلتا رہا۔ اسکا نتیجہ بہت اچھا آتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک ہاسٹل بھی تھا۔ جہاں لڑکوں کی رہائش اور خوراک کا معقول بندوبست تھا۔ لیکن ۱۹۷۱-۷۲ء میں موجودہ حکومت کی تعلیمی پالیسی کے مطابق اسے قومیا لیا گیا۔

پیر صاحب کی موجودہ زندگی

آپ کی شادی مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ صاحب جیلانی ساکن جمال الدین والی (ریاست بھاولپور) کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے آپ کے تین فرزند اور دو دختر ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے سید صبغت اللہ شاہ عرف راجہ سائیں ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۷ء بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ آپ کے دوسرے صاحبزادوں کے اسماء گرامی سید علی گوہر شاہ اور سید صدرالدین شاہ ہیں۔ آپ آج کل اپنے بنگلہ (کنگری ہاؤس) کے۔ ڈی۔ اے اسکیم نمبر ا میں اپنے اہل وعیال سمیت رہتے ہیں۔ متحدہ جمہوری محاذ کے صدر ہونے کی حیثیت سے اکثر بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں آپ کے در دولت پر حاضر ہوتی رہتی ہیں۔ آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ روشن خیال۔ عالی ظرف۔ بیدار مغز۔ محب وطن اور بڑے ہی رحم دل اور مخلص انسان ہیں۔ ہم بعض مجبوریوں کی وجہ سے آپ کی سیاسی زندگی کی مکمل تصویر اس ایڈیشن میں پیش کرنے سے معذور ہیں۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اسکی تلافی کر دی جائے گی۔

ہماری دعا ہے کہ اس عالی خاندان کی یہ شمع فروزاں رہے اور اس سے علم و حکمت۔ اخلاق و شرافت اور شریعت و طریقت کا اُجالا پھیلتا رہے۔ ہم ان پیرانِ عظام کے صدقے میں اللہ تعالیٰ سے اس کے عفو و کرم کے طلبگار ہیں تاکہ اسکی رحمتِ بے پایاں سے دامن بھر سکیں۔

حوالہ جات کی کتابیں

۱ — لُبِ تاریخ سندھ	(فارسی)	مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۲ — جنت السندھ	(سندھی)	"
۳ — تاریخ معصومی	"	"
۴ — تحفۃ الکرام	"	"
۵ — چچ نامہ (فتح نامہ سندھ)	"	"
۶ — آئینۂ قدیم سندھ	"	آر - ایچ - احمد اینڈ سنز حیدرآباد
۷ — جنب گذاریم جن سیں	"	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۸ — تاریخ ریگستان	"	"
۹ — قدیم سندھ	"	"
۱۰ — سندھ جی اقتصادی تاریخ	"	"
۱۱ — برہان پور کے سندھی اولیاء	اردو	"
۱۲ — تاریخ سندھ (کلہوڑہ عہد)	"	"
۱۳ — تذکرہ صوفیائے سندھ	"	اردو اکیڈیمی کراچی
۱۴ — عبرت کدۂ سندھ	"	نفیس اکیڈیمی کراچی
۱۵ — سیرت احمد شہید	"	"
۱۶ — آئینۂ حقیقت نما	"	"
۱۷ — سرگذشتِ مجاہدین	"	غلام علی اینڈ سنز لاہور
۱۸ — الزبیر (آزادی نمبر)	"	اردو اکیڈمی بہاولپور
۱۹ — مہران سہ ماہی (مختلف شمارے)	"	حیدرآباد
۲۰ — ملفوظات روضے دھنی	سندھی	مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم مشوری صاحب
۲۱ — آبِ کوثر	اردو	فیروز سنز لاہور
۲۲ — موجِ کوثر	"	"
۲۳ — دورِ مستقبل	"	سردار محمد شفیع
۲۴ — سانگھڑ	سندھی	غلام علی اینڈ سنز کراچی
۲۵ — قدیم سندھ جا شہر اور ماڑھو	"	مرزا قلیچ بیگ
۲۶ — THE TERRORIST BY. H.T LAMBRICK		
۲۷ — تاریخ فرشتہ	اردو	مصنفہ محمد قاسم فرشتہ۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور